

قرآن کا مطالعہ کیسے؟

انہ:

حضرت مولانا محمد اویس نگرانی ندوی

شیخ التفسیر دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ،

مجلس نشریات اسلام

۱۔ سہ ۳ ناظم آباد مینشن۔ ناظم آباد۔ کراچی ۷۴۶۰۰

قرآن کا مطالعہ کیسے؟

انہ:

حضرت مولانا محمد اویس نگرانی ندوی
شیخ التفسیر دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ،

مجلس شریات اسلام

۱۔ کے۔ ۳ ناظم آباد مینشن۔ ناظم آباد کراچی ۴۶۰۰

پاکستان میں جملہ حقوق طباعت و اشاعت
بجی فضل ربی ندوی محفوظ ہیں

انتساب

حضرت الاستاذ علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ

کے نام

جن کی توجہات عالیہ نے میرے اندر قرآن مجید کا

ذوق پیدا کیا

اللہ تعالیٰ استاد مرحوم کو اپنی بے حساب جہتوں سے سرفراز فرمائے۔

اولیں ندوی

نام کتاب	_____	قرآن کا مطالعہ کیسے؟
تصنیف	_____	مولانا محمد اویس نگر امی ندوی
طباعت	_____	شیگل پرنٹنگ پریس کراچی
اشاعت	_____	۱۹۹۸ء
ضخامت	_____	۶۶ صفحات
ٹیلیفون	_____	
	_____	۶۲۱۸۱۶

ناشر
فضل ربی ندوی

مجلس نشریات اسلام ۱۔ ۳۔ ناظم آباد منیشن، ناظم آباد کراچی ۴۔

پیش لفظ

۱۔ مولانا عبدالمجید صاحب دریا آبادی (صاحب تفسیر مجیدی) رحمۃ اللہ علیہ

تلاوت قرآن مجید اگر محض بہ غرض اجر و ثواب فقط ناظرہ ہے جب بھی اس کے کچھ ادب اور قاعدے ہیں اور اگر قرآن بھی کسی درجہ میں مقصود ہو تب تو یہ آداب و قواعد ظاہر ہے کہ اہم تر ہی ہو جائیں گے اور ان کی فہرست بھی خاصی طویل ہو جائے گی۔

سب سے مقدم شرط تو پڑھنے والے کے قلب کا ربط و تعلق قرآن مجید کے ساتھ ہے۔ تلاوت کے وقت جس درجہ قلب میں خشیت و خشکی ہوگی یا پھر شوق و نشاط ہوگا اور جس حد تک اس کے کلام الہی ہونے کا استحضار ہوگا اسی نسبت سے وہ اس خزانہ ہدایت سے فیض حاصل کرے گا اور اسی درجہ میں اس پر اس کتاب حکیم کے معنی و مطلب اور اسرار کھلتے ہیں گے تقویٰ و طہارت جس درجہ میں بھی اپنے سے بن پڑے۔ فہم قرآنی کی اولین و لازمی شرط ہے۔ سرتاسر خلاف شریعت زندگی رکھنے والے اور اپنے کو دانستہ فسق و فجور میں غرق رکھنے والے پر قرآن قیامت تک نہیں کھل سکتا۔ اس سے نیچے مرتبہ میں کچھ اور بھی شرطیں مثلاً عربیت سے واقفیت عام دینی تعلیم و تربیت۔ تاریخی پس منظر یعنی نزول قرآن کے وقت متکبرین و مومنین دونوں کے طرز زندگی عادات و حالات سے متعلق معلومات دوسری ملتوں کے عفت و اعمال پر نظر وغیرہ۔

ضرورت تھی کہ اس کتاب الہی سے مستفید ہونے والوں کیلئے کوئی ہدایت نامہ کسی صاحب فن کے قلم سے موجود ہوتا۔ دلی مسرت اس امر کے اظہار میں ہے کہ اس ضرورت کو ایک ندوی فاضل اور اہل قلم نے پورا کر دیا۔ وہ یہی نہیں کہ دارالعلوم ندوہ میں فن تفسیر کے استاد اور سالہا سال کا تجربہ درس قرآن کار کھتے ہیں بلکہ اپنے ذوق و وجدان کے لحاظ سے صحیح معنی میں قرآنیات کے عالم و متعلم ہیں۔ ان کا مطالعہ اس باب میں بڑا وسیع اور ان کی نظر اس خصوص میں ماشار اللہ گہری ہے ”ذَٰلِكَ فَضْلُ اللَّهِ يُؤْتِيهِ مَن يَشَاءُ“

ابن قیم کی تفسیر انہیں نے بہت سی کتابوں کو کھنگال کر اور بڑی دیدہ ریزی سے انقاط کر کے مرتب و شائع کی ہے اور جینتیوں سے بھی اپنے کو خدمت قرآن کیلئے وقف کئے ہوئے ہیں۔ ان کی یہ کتاب گو مختصر ہے پھر بھی اپنے موضوع پر کافی ہے اور ان کی فہرست خدمات قرآنی میں ایک محفول و معتد بہ اضافہ ہے۔

عبدالمجید دریا آبادی

بارہ بنکی

۱۴ ستمبر ۱۹۶۵ء

دوسرا گردہ وہ ہے جو اپنے ذہنوں میں اسلام کا خود ایک تصور رکھتا ہے، اُس کے پاس کچھ خود ساختہ خاکے اور اپنے بنائے ہوئے نقشے ہیں۔ یہ گروہ قرآن کی آیات کو اپنے انہیں تصورات کی روشنی میں دیکھنا چاہتا ہے اور اسلام کے نظام حیات کو انہیں خاکوں اور نقشوں کے مطابق مرتب کرنا چاہتا ہے! مختصر یہ کہ یہ لوگ اپنی فکر کو قرآن کا پابند نہیں کرنا چاہتے ہیں بلکہ قرآن کو اپنی فکر کا باند کرنا چاہتے ہیں۔

یہ دونوں طبقے بڑے ہی حرام نصیب ہیں۔ ان کو غور کرنا چاہیے کہ قرآن مجید جس سے ہم نے اپنی سیبختی کی وجہ سے منہ موڑ رکھا ہے یا جس کو ہم نے غلط طریقوں سے سمجھنے کی کوشش کی ہے درحقیقت یہی وہ نسخہ برکیمیا ہے جس کے استعمال سے قزاق و رہزن، جبریل امین کے اسرار کے امین و ہم راز بن گئے تھے یہی وہ کج گرا نسیا ہے جس کو پاکر بادیہ نشینوں کی نگاہوں میں محل و گوہر خرف ریزوں سے زیادہ قیمت نہ رکھتے تھے یہی علم و حکمت کا وہ بیش بہا خزانہ ہے کہ بڑے بڑے عقلدار روزگار کو اسی کی رہنمائی کے سہارے اپنی زندگی کی منزل کو طے کرنے کا فیصلہ کرنا پڑا اور اُس کے حکیمانہ نظریات کے مقابلہ میں اپنی محدود عقل و خرد کی شکست کے اعتراف ہی میں ان کو لذت محسوس ہوئی۔ اس لئے ضرورت ہے کہ مسلمانوں کے رُخ کو اسی قبلہ مقصود کی طرف موڑا جائے۔ اس آہوئے رم خوردہ کو پھر سونے حرم لے جایا جائے اور اس مقدس آسمانی صحیفہ کی وساطت سے اپنے بخت خفہ کو پھر بیدار کیا جائے۔ آئندہ سطروں میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس کا اصل مقصد یہی ہے کہ مسلمانوں کو قرآن مجید سے استفادہ کی طرف متوجہ کیا جائے اور اُن کو اس راہ کی مشکلات سے بھی آگاہ کیا جائے اور وہ طریقہ بتلایا جائے جس سے درمقصود ہاتھ آئے اور منزل مطلوب تک رسائی ہو۔ ہماری معروضات کو پڑھ کر شبہ ہو سکتا ہے کہ ہم نے قرآن مجید سے استفادہ کو قیود و

حرفِ آغاز

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

قرآن مجید اللہ تعالیٰ کا کلام ہے۔ یہ اس کا پہلا اور حقیقی شرف ہے۔ دوسرا شرف یہ ہے کہ جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جیسے جلیل القدر نبی کے سپرد اس کی تعلیم تشریح اور تذکیر کا کام ہوا، ان نسبتوں کی عظمت اور بلندی کا تقاضا یہ تھا کہ قرآن مجید ہماری توجہات کا مرکز بن جاتا اور زندگی کے شیب و فراز میں اسی کی رہنمائیاں ہمارے لئے مشعلِ راہ بنتیں

مگر

افسوس کا مقام ہے کہ مسلمانوں کا ایک بڑا حصہ اس مقدس صحیفہ کے مضامین و مطالب سے نا آشنا ہے اور صدہ پر صدہ یہ ہے کہ اس دوری و مجہوری پر اُن کو کچھ افسوس بھی نہیں ہے۔ اُن کو بھول کر یہ بھی خیال نہیں آتا ہے کہ اُن کی میزوں پر الماریوں میں اور گھروں کے طاقوں پر قرآن مجید کے جو نسخے رکھے ہوئے ہیں وہ اپنے اند کوئی پیغام بھی رکھتے ہیں زندگی کے مسائل کا، اُن کے پاس کوئی حل ہے اور وہ ایک خاص دعوت کے داعی اور منادی ہیں۔

شرائط کے ذریعہ بہت ہی محدود کر دیا ہے لیکن اللہ بہتر جانتا ہے کہ مقصود محض اظہار حق اور خیر خواہی ہے۔ ہمارے سامنے مسلمانوں کی سائے تیرہ سو برس کی تاریخ کے صفحات کھلے ہوئے ہیں۔ تاریخ کے یہ اوراق ہم کو بتلانے ہیں کہ قرآنی آیات کو نا فہم لوگوں نے کس طرح اپنے مقاصد اور مطالب کے سلسلہ میں استعمال کرنے کی کوشش کی ہے۔ انہوں نے خود کو قرآن سے اپنی فکر اور اپنے تصورات کے قریب کرنا چاہا۔

پورے وثوق کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ اس سلسلہ میں جن لوگوں سے ارادی یا غیر ارادی طور پر غلطیاں ہوئی ہیں اس کی بڑی وجہ یہی ہے کہ انہوں نے فہم قرآن کے اصول و شرائط کی رعایت نہیں کی اور نتیجہ یہ ہوا کہ ان میں سے ہر شخص اپنی رائے کو قرآن سے مدلل سمجھنے لگا اور اس پر مطمئن ہو گیا جس کا دل چاہے رازی کی حج القرآن نیز کلامی لٹریچر کو پڑھ کر ہماری رائے کی تصدیق کر سکتا ہے۔

اس لئے مناسب معلوم ہوا کہ اہل ذوق کو صحیح راستہ کی نشان دہی کر دی جائے جس کے اختیار کرنے کے بعد انشاء اللہ کلام الہی کے اسرار کے گھٹنے کی توقع اور مقصود حقیقی کے حصول کی امید ہے۔

وَاللّٰهُ وَلِيُّ التَّوْفِیْقِ

محمد اویس ندوی نگرانی

دارالعلوم ندوۃ العلماء

لکھنؤ

یکم ستمبر ۱۹۶۵ء

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

(۱)

قرآن مجید کے سچے طالب علم اور اس سے حقیقی استفادہ کرنے والے کے لئے پہلی شرط یہ ہے کہ اس کا دل قرآن مجید کی عظمت سے معمور ہو اور یہ نوریتیں اس کی رگ و پے میں سرایت کئے ہوئے ہو کہ :-

ایس صفت است از صفات ازلیہ بانیہ کہ قرآن مجید اللہ تعالیٰ کی صفات ازلیہ میں سے
آر ابعالم امکان بیچ گو نہ مناسبے نہ بودہ ایک صفت ہے۔ اس صفت کو اس عالم
حضرت حق جل و علا، محض بعنایت خود امکان سے کوئی مناسبت نہیں۔ اللہ تعالیٰ
در کسوت زبان عربی ہماں و صفت نے محض اپنی مہربانی سے اپنے اس کمال ذاتی
ازلی و کمال ذاتی خود را انزال فرمودہ اور وصف ازلی کو عربی زبان کا جامہ پہنا کر
ہمیں را واسطہ فیما بینہ و بین العباد نازل فرمایا اور اس کو اپنے اور بندوں کے درمیان
گروایندہ - واسطہ بنایا -

(صراط مستقیم :- از مولانا اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ)

عقیدہ کے اعتبار سے ہر مسلمان قرآن مجید کو اللہ کا کلام تسلیم کرتا ہی ہے لیکن اس سے نفع اٹھانے کیلئے اس عقیدہ کا استحضار ضروری ہے -

قرآن مجید میں بار بار فرمایا گیا ہے کہ قرآن کو ہم نے اتارا ہے! قرآن اللہ کی طرف

سے ہے۔ خوب ذہن نشین رہنا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ کا اس طرح قرآن مجید کو اپنی طرف منسوب فرمانا اور اس نسبت کو بار بار ظاہر فرمانا محض سلسلہ سند کے بیان کیلئے نہیں ہے بلکہ اس سے قرآن مجید کی عظمت اور بلندی کا اظہار بھی مقصود ہے اس لئے کہ متکلم کی عظمت اور اس کا مرتبہ کلام کی عظمت کا باعث ہوا کرتا ہے۔

ہزار جان گرامی فدا بہ این نسبت
کہ میری ذات سے اپنا پتہ دیا تو نے

اس نسبت خداوندی کی وجہ سے قرآن کی عظمت اور اس کے مضامین پر یقین کا پیدا ہونا ہی دراصل شیعہ ایمان کی روشنی کا باعث ہے۔

ظلم و جہول انسان قرآن مجید کی اس نسبت کی عظمت اور جلالت کو نہ محسوس کرے تو یہ اس کی کم مائیگی اور کوہ تاہ نظری ہے ورنہ حال تو یہ ہے کہ:-

لَوْ أَنْزَلْنَا هَذَا الْقُرْآنَ عَلَى
جَبَلٍ لَّرَأَيْنَاهُ خَا شِعًا
مَّتَصِدًّا عَا مِّنْ خَشْيَةِ اللَّهِ ۖ

اگر ہم اتارتے یہ قرآن ایک پہاڑ پر، تو تو دیکھ
لیتا کہ وہ دب جاتا، بھٹ جاتا اللہ کے ڈر سے۔

(سورہ حشر ۱۲)

یعنی صاحب قرآن کی عظمت کا یہ عالم ہے کہ اگر یہ قرآن کسی پہاڑ پر اتارا جاتا تو متکلم کی ہیبت و جلالت کے سامنے وہ دب جاتا اور خوف کی وجہ سے بھٹ کر پارہ پارہ ہو جاتا بجنت کے ارجمند اور طالع کے فیروز مند قرآن کی اس نسبت کی یقین داؤعان سے بہرہ مند ہیں ان کا معاملہ یہ ہے کہ:-

وَإِذَا سَمِعُوا مَا أُنْزِلَ إِلَى
الرَّسُولِ تَرَىٰ أَعْيُنُهُمْ تَفِيضُ

اور جب سنتے ہیں اس کی جواز رسول پر تو تو
دیکھے ان کی آنکھوں کو کہ ابھتی ہیں آنسوؤں سے

مِنَ الدَّمْعِ مَتَاعًا عَزَّ فَوَافِقُ الْحَقِّ - (سورہ مدہ ۱۱) اس لئے کہ انہوں نے پہچان لیا حق بات کو۔
یہ سعادتمند نفوس جب اللہ کا کلام سنتے ہیں تو ان کے دل کانپ اٹھتے ہیں،
اور بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، خوف اور رعب کی کیفیت طاری ہو کر ان کے
قلب و قالب اور ظاہر و باطن کو اللہ کی یاد کے سامنے جھکا دیتی ہے ارشاد فرمایا:-

اللَّهُ نَزَّلَ أَحْسَنَ الْحَدِيثِ كِتَابًا
مُّتَشَبِهًا مَّثَانِ تَفْشَعُ مِنْهُ
جُلُودُ الَّذِينَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ
ثُمَّ تَلِينُ جُلُودُهُمْ وَقُلُوبُهُمْ
إِلَىٰ ذِكْرِ اللَّهِ (سورہ زمر ۳)

اللہ نے اتاری بہترین کتاب میں ملتی دھراتی
ہوئی بال کھڑے ہو جاتے ہیں اس سے کھال
پران لوگوں کے جو ڈرتے ہیں اپنے رب سے
پھر نرم ہوتی ہیں ان کی کھالیں اور ان کے دل
اللہ کی یاد پر

ان پاک نفسوں کا یہ حال ہے کہ اللہ کا کلام ان کے ایمان کو مزید ترقی فرماتا ہے۔
إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ إِذَا ذُكِرَ
اللَّهُ وَجِلَتْ قُلُوبُهُمْ وَإِذَا
تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ آيَاتُهُ زَادَتْهُمْ إِيمَانًا
(سورہ انفال ۱)

ایمان والے وہی ہیں کہ جب نام اللہ کا آیا تو
ڈرجائیں ان کے دل اور جب پڑھا جائے ان پر
اس کا کلام تو زیادہ ہو جاتا ہے ان کا ایمان۔

اور اسی نسخہ شفا میں ان کو اپنے قلبی اور روحانی امراض کے علاج کا سامان
مل جاتا ہے:-

وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْآنِ مَا هُوَ شِفَاءٌ
وَرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِينَ -

اور ہم اتارتے ہیں قرآن میں سے جس سے
ردگ دور ہوں اور رحمت ایمان والوں
کے واسطے۔

(بنی اسرائیل ۹)

حاصل یہ ہے کہ قرآن مجید سے نفع اٹھانے کیلئے ضروری یہ ہے کہ قرآن کی عظمت اور اس کی صداقت کا یقین لہو کے مانند رگوں میں دوڑتا ہوا اور تلاوت و تدبر کی کیفیت ہو کہ قرآن مجید ہی اس کا مونس و ہدم بن گیا ہو امام شاطبی (المتوفی ۷۹۷ھ) نے موافقات میں صیح فرمایا۔

”جو شخص دین کو جاننا چاہتا ہے اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ قرآن ہی کو اپنا مونس و ہدم بنائے۔ شب و روز قرآن ہی سے تعلق ہو، یہ ربط و تعلق علمی اور عملی دونوں طریقوں سے ہونا چاہئے۔ ایک ہی پر اکتفا نہ کرے جو شخص یہ کرے گا امید ہے کہ وہ مقصود کو پالے گا۔ (الموافقات ج ۳ ص ۳۶۶)

(۲)

جس طرح اللہ تبارک و تعالیٰ نے اپنی صفت کلام کو زبان عربی کا لباس پہنا کر اور اس کو قرآن مجید کا نام دے کر اپنے اور بندوں کے درمیان واسطہ بنایا اسی طرح حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس کو قرآن کی تشریح و تفصیل اور اس کی علمی تفسیر کیلئے مطلع انوار بنایا اس لئے قرآن مجید سے نفع اٹھانے کیلئے ضروری ہے کہ پورے شرح صدر کے ساتھ اس وجود گرانی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ اعتماد، اتباع اور انقیاد کا تعلق ہو اس واسطہ کے بغیر قرآن مجید سے استفادہ کی امید کرنا ایک فعل عبث ہے۔

خود قرآن مجید نے اپنا اور پیغمبر کا جو رشتہ اور تعلق ظاہر کیا ہے وہ اس بات کے لئے واضح دلیل ہے کہ قرآن مجید سے استفادہ کرنے والوں کے لئے دامن نبوت صلی اللہ علیہ وآلہ و اصحابہ وسلم سے وابستگی ضروری ہے۔ ارشاد فرمایا:۔

يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَهُوَ (رسول) اُنْ كَوَّلَهُ اٰيَاتِيْنَ سَنَّا اَد

وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ۔ سنو! اور ان کو کتاب و حکمت سکھاتا ہے۔

(سورہ جمعہ - ۱)

معلوم ہوا کہ اللہ کی کتاب کی تعلیم پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کے نبوت کے فرائض میں داخل تھی۔ دوسرے موقع پر ارشاد ہوا:۔

وَاَنْزَلْنَا اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نَزَلَ اِلَيْهِمْ وَاعْلَاهُمْ يَتَفَكَّرُونَ۔ (سورہ نمل ۶)

اور ہم نے تیری طرف یہ نصیحت (کی کتاب) اتاری تاکہ لوگوں کی طرف جو اتارا گیا ہے تو اس کو کھول کر بتائے۔ شاید وہ سوچیں۔

مطلب یہ ہے کہ قرآن مجید کی تعلیم اور اس کے شرح و بیان کی ذمہ داری خدا کی طرف سے پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کے سپرد کی گئی ہے، اب اس نور نبوت (صلی اللہ علیہ وسلم) سے الگ ہو کر قرآن مجید پر غور کرنا اور اس کے مضامین سے نفع اٹھانے کی توقع رکھنا بحر ظلمات میں قدم رکھنا ہے۔

اسی لئے جب مطرف بن شیخ سے ایک شخص نے کہا کہ آپ ہمارے سامنے قرآن کے سو کچھ بیان کیجئے تو انہوں نے فرمایا:۔

والله ما نريد بالقرآن بدلاً ولكن الله ما نريد من هو اعلم بالقرآن۔

اللہ کی قسم قرآن کے بجائے ہم بھی کوئی اور کتاب نہیں چاہتے لیکن ہم قرآن کے ساتھ اس کا تلاش بھی ضروری ہے جو قرآن کا سب سے زیادہ

سمجھنے والا تھا۔ (یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ

وسلم)

امام شاطبی فرماتے ہیں کہ

سنت کتاب اللہ کیلئے بمنزلہ شرح وتفسیر کے ہے۔

الموافقات ج ۴ ص ۱

یہ سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم وہ انعام خداوندی ہے جس کو قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کے مخصوص احسانات کے ضمن میں شمار فرمایا گیا ہے۔

لَقَدْ مَنَّ اللَّهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ إِذْ
بَعَثَ فِيهِمْ رَسُولًا مِنْ أَنْفُسِهِمْ
يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَ
يُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ (آل عمران، ۱۰)

یقیناً اللہ نے ایمان والوں پر احسان کیا کہ ان میں
انہیں میں سے ایک رسول بھیجا جو ان کو اس کی
آیتیں پڑھ کر سناتا ہے اور ان کو سنوارتا ہے
اور ان کو کتاب و حکمت سکھاتا ہے۔

ابو حیان اندلسی اپنی تفسیر البحر المحیط (ج ۱ - ص ۳۹۳) میں حکمت کے معنی
بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

قال مجاهد الحكمة فهم القرآن
امام طبری فرماتے ہیں:-

”ہمارے نزدیک صحیح بات یہ ہے کہ حکمت ان احکام الہی کے علم کا نام ہے جو صرف
رسول کے بیان (تشریح) سے معلوم ہوتے ہیں۔“
امام شافعی کتاب الرسالہ میں لکھتے ہیں:-

”میں نے قرآن کے ان اہل علم سے جن کو پسند کرتا ہوں یہ سنا کہ حکمت آنحضرت صلی
اللہ علیہ وسلم کی سنت کا نام ہے۔“

قرآن مجید سے نفع اٹھانے میں اس حکمت یعنی سنت کو اس قدر دخل ہے کہ امام
شافعی نے اپنا فیصلہ سنا دیا:-

ولا يقدر عليه الا من زاول ما

يعينه على ذلك من السنة المبينة

للكتاب (الموافقات ج ۳ - ص ۳)

اور قاضی ابن العربی مالکی نے تو یہاں تک فرمایا کہ:-

”قرآن مجید کا ہر وہ لفظ جس سے کوئی حکم نکلتا ہو وہ لفظ مجمل ہو تو اس کی تشریح
حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد پر موقوف ہوگی، اس کی تفصیل کو شریعت میں
تلاش کیا جائے وہ ضرور ملے گی۔ اگر ہم فرض کر لیں کہ اسکی تشریح نہیں ملتی ہے تو اس حکم کی
ذمہ داری باقی نہیں رہے گی۔“ (احکام القرآن ج ۱ ص ۵۸)

ائمہ دین کی ان تصریحات سے صاف واضح ہے کہ فہم قرآن کیلئے سنت نبوی (صلی
اللہ علیہ وسلم) سے ربط و تعلق کس قدر ضروری ہے۔

(۳)

قرآن مجید سے مکمل اور صحیح استفادہ کیلئے ضروری ہے کہ ہم کو اس سے نفع حاصل
کرنے کی فکر ہو اور اس کے برکات سے مستفید ہونے کی طلب بھی دل میں موجزن ہو۔ اسی
لئے ارشاد فرمایا:-

هٰدِيَ لِلْمُتَّقِينَ (بقرہ - ۱)

راہ بتلائی ہے ڈرنے والوں کو۔

جناب مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی کا ارشاد ہے کہ یہاں تقویٰ سے مراد اس
کے اصطلاحی معنی نہیں ہیں بلکہ لغوی معنی مقصود ہیں۔ یعنی خوف و کھٹک، اس اعتبار سے
قوت کا مطلب یہ ہوگا کہ

جن لوگوں کے قلب میں کھٹک ہے اور فکر و قصد ہے اپنی اصلاح کی قرآن اُن کو ہدایت

کرتا ہے۔“

مولانا نوتوی نے اس موقع پر بہت ہی لطیف استدلال فرمایا ہے ان کا ارشاد ہے:-
 ”سورہ واللیل میں ارشاد ہے، فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰی وَ اٰتٰی وَ صَدَقَ بِاَلْحُسْنٰی -
 اس کے بعد ارشاد ہے۔ وَاَمَّا مَنْ بَخِلَ وَ اسْتَغْنٰی وَ كَذَّبَ بِاَلْحُسْنٰی۔ یہاں
 صنعت تقابل کا استعمال کیا گیا ہے چنانچہ پہلی آیت میں اعطاء کا ذکر ہے تو دوسری آیت میں
 اس کے مقابل میں ”بخل“ کا استعمال ہے۔ اسی طرح پہلی آیت میں ”گذب“ ہے تو دوسری
 مرتبہ ”صدق“ اسی طرح ”استغنی“ اور ”اتقی“ کا تقابل ہے۔ اس تقابل کی وجہ سے
 تقویٰ کے وہ معنی ہوں گے جو استغنیٰ کے مقابل ہوں۔ استغنیٰ کے معنی بے فکری کے
 ہیں تو تقویٰ کے معنی ہوں گے، فکر اور کھٹک، (ملفوظات حضرت تھانویؒ ج ۱، ص ۱۲۷)

بے شبہ واقعہ یہی ہے کہ قرآن مجید سے استفادہ کرنے کیلئے طلب صادق کی ضرورت
 ہے، اس کے بغیر یہ راہ کھلتی نہیں ہے۔ طلب صادق کا مطلب یہ ہے کہ جو چیزیں قرآن
 مجید سے استفادہ کرنے میں معاون ہوں ان کو اختیار کیا جائے اور جو چیزیں مضر ہوں ان سے
 احتراز کیا جائے۔

حافظ جلال الدین سیوطی نے اتقان میں ابو المعانی کی برہان کے حوالہ سے اس
 موقع کیلئے بڑے کام کی بات لکھی ہے۔ فرماتے ہیں:-

”اگر کسی کے دل میں بدعت، تکبر، خواہش نفسانی اور دنیا کی محبت موجود ہے یا وہ
 گناہ کا عادی ہے، یا ایمان کمزور ہے، تحقیق کا مادہ کم ہے غیر مستند لوگوں کی تفسیر قبول کر لیتا
 ہے تو نہ وہ قرآن سمجھ سکتا ہے اور نہ اس پر اس کے اسرار کھل سکتے ہیں۔“

اس کے بعد صاحب برہان کے اس قول پر حافظ سیوطی نے حسب ذیل آیت سے

استدلال کیا۔

سَاَصْرَفُ عَنْ اٰیَاتِی الَّذِیْنَ یَسْتَكْبِرُوْنَ
 فِی الْاَرْضِ بِغَیْرِ الْحَقِّ -
 میں پھیر دوں گا اپنی آیتوں سے ان کو جو تکبر کرتے
 ہیں زمین میں ناحق۔ (اعراف)

پھر اس آیت کی تفسیر میں سفیان بن عیینہ سے یہ نقل فرمایا کہ:-

”ایسے لوگوں سے فہم قرآن چھین لیا جاتا ہے۔“ (اتقان - ج ۲ ص ۱۸۱ - مصر)

آیت ذیل بھی اسی طرف اشارہ کرتی ہے۔

اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَذِکْرًا لِّمَنْ كَانَ لَهُ قَلْبٌ
 اَوْ اَلْقٰی السَّمْعَ وَ هُوَ شَهِیْدٌ - (ق - ۳)
 اس میں سوچنے کی جگہ ہے اس کو جس کے اندر دل
 ہے یا لگائے کان دل لگا کر۔

حافظ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:-

”کسی چیز کی تاثیر کیلئے ضروری ہے کہ (۱) کوئی مؤثر ہو (۲) جس پر اثر ڈالنا
 مقصود ہو۔ وہ ہو (۳) اثر ہونے کے شرائط موجود ہوں (۴) جو چیزیں اثر
 کو زائل کرنے والی ہوں وہ نہ ہوں۔ اس آیت میں (قرآن مجید سے استفادہ
 کے سلسلہ میں) ان سب چیزوں کا ذکر موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ کے قول اِنَّ
 فِیْ ذٰلِكَ لَذِکْرًا میں مؤثر کی طرف اشارہ ہے۔ ”لِمَنْ كَانَ
 قَلْبٌ“ سے قلب بیدار مراد ہے (اس لئے کہ نصیحت قبول کرنے کی جگہ دل ہی
 ہے۔)

قرآن نے ارشاد فرمایا۔

اِنَّ هُوَ اِلَّا ذِکْرٌ وَّ قُرْاٰنٌ
 مُّبِیْنٌ لِّیُنْذِرَ مَنْ كَانَ
 یہ تو خالص نصیحت ہے اور قرآن ہے
 صاف تاکہ ڈر سنائے اس کو جس میں

حَتَّىٰ - (تکین ۵) جان ہو۔

اَلْقَى السَّمْحَ کا مطلب یہ ہے کہ جو کہا جائے اس کو دل لگا کر سنے۔ کسی بات سے متاثر ہونے کی یہی شرط ہے۔ وَهُوَ شَهِيدٌ کا مطلب یہ ہے کہ دل حاضر ہو غفلت اور بے فکری اثر نہیں ہونے دیتی ہے۔“

پس جب مؤثر یعنی قرآن مجید اور محل قابل یعنی قلب بیدار اور اثر ہونے کی شرط یعنی توجہ کامل موجود ہو اور اثر کو زائل کرنے والی چیز یعنی غفلت اور بے فکری نہ ہو تو (انشار اللہ) مقصود یعنی قرآن سے نفع حاصل ہو جائے گا۔ (تفسیر القیم ص ۴۴)

(۴)

قرآن مجید کے طالب علم کا ذہن۔ اس معاملہ میں بھی صاف ہونا چاہئے کہ ہم کو قرآن مجید سے کن امور میں رہنمائی کی ضرورت ہے؟ قرآن مجید کا موضوع اور اس کا عنوان کیا ہے؟ اس عقدہ کا حل نہ ہونے کی وجہ سے اس راہ کے کتنے مسافر منزل مقصود سے محروم رہے۔ وہ سراب کو اپنی تشنہ لہی کا سامان سمجھ اور نتیجہ میں حیرانی و پریشانی کے سوا کچھ ہاتھ نہ آیا۔ اس حقیقت کو خوب اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ قرآن مجید کی اصل دعوت انسان کو سعادت ابدی کی طرف بلانا ہے۔ وہ انسان کے ظاہر و باطن کی ایسی تعمیر کرنا چاہتا ہے کہ حیات اخروی میں اس کو کوئی زحمت نہ پیش آئے، وہ انسان کا ایسا تزکیہ کرنا چاہتا ہے کہ وہ بارگاہ الہی میں حضوری کے لائق بن سکے۔

بے شبہ قرآن مجید نے دنیاوی زندگی کے تمام اصولی قواعد مرتب فرمائے ہیں، انفرادی اور اجتماعی زندگی کے قوانین، عقائد، عبادات، اخلاق، معاملات، حقوق اور آداب

اس نے سب سے بحث فرمائی ہے، مگر ان تمام امور میں بنیادی نقطہ نظر اخروی سعادت ہے یہی وجہ ہے کہ ان مباحث کا جن آیات میں ذکر آتا ہے ان کے اول یا آخر میں یا درمیان میں ترغیب یا ترہیب کی آیتیں، جنت و دوزخ اور عذاب کا ذکر ضرور ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ میں سے موقع کے اعتبار سے کسی مناسب اسم و صفت کا تذکرہ ضرور ہوتا ہے تاکہ پڑھنے والا یہ بات سمجھتا رہے کہ ان قوانین کے پیروی کے نتیجہ میں ابدی راحت اور نافرمانی کی صورت میں اخروی ذلت کا سامنا کرنا پڑے گا۔ امام شافعی نے الموافقات (ج۔ ۳) میں بڑے کام کی بات کہی کہ

”قرآن مجید کے اصل علوم تین ہی ہیں (۱) ذات حق کی معرفت (۲) حق تعالیٰ کی رضا کی صورتیں (۳) انسان کا انجام۔ پہلے علم یعنی ذات حق کی معرفت میں اللہ تعالیٰ کے اسماء و صفات اور افعال کا علم داخل ہے اور اسی سلسلہ میں نبوت سے بھی بحث ہے اس لئے کہ عبد اور معبود کے درمیان یہی واسطہ ہے، دوسرے علم میں عبادات اور معاملات وغیرہ داخل ہیں۔ تیسرے علم میں موت اور اس کے احوال، قیامت اور اس کے شملات اور جنت و دوزخ کے احوال داخل ہیں، اسی قسم میں ترغیب اور ترہیب کی آیات اور وہ آیتیں جن میں نیکو کاروں کی نجات اور بدکاروں کے برے انجام کے واقعات بیان کئے گئے ہیں وہ بھی شامل ہیں۔“

مقصود یہ ہے کہ قرآن مجید کا اصل موضوع، انسان کی وہ رہنمائی ہے جس سے دنیا میں وہ ایسی زندگی گزارے جو آخرت میں اس کے لئے نفع بخش ہو اور رضائے الہی اس کے نصیب میں آئے۔

قرآن مجید نے اپنے کو دنیا میں اسی پیغام کے ساتھ پیش کیا ہے اور اپنی دعوت کے اسی عنوان کی طرف لوگوں کو متوجہ کیا ہے۔ اسی سلسلہ کی چند آیات ملاحظہ ہوں۔

ذَلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيهِ هُدًى
لِّلْمُتَّقِينَ۔ (بقرہ)

إِنَّ هَذَا الْقُرْآنَ يَهْدِي لِلَّتِي
هِيَ أَقْوَمُ۔ (اسراء)

وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْآنِ مَا هُوَ شِفَاءٌ
وَرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِينَ۔

قُلْ هُوَ الَّذِي أَنْعَمَ عَلَيْنَا وَهُدًى
وَشَفَاءٌ (فصلت)

يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَكُمْ
مَوْعِظَةٌ مِّن رَّبِّكُمْ وَشِفَاءٌ

لِّمَا فِي الصُّدُورِ وَهُدًى وَرَحْمَةٌ
لِّلْمُؤْمِنِينَ۔ (یونس)

حاصل یہ ہے کہ قرآن کے احکام، تعلیمات، ارشادات اور اس کی ہدایات ہی اس کے وہ اوصاف خصوصی ہیں جو اس کی دعوت کا اصل موضوع ہیں، اسی لئے اہل علم کی ایک

جماعت مثلاً شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ اور حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے اسی کو قرآن کا اصلی اعجاز قرار دیا ہے۔ پس قرآن مجید کی آیات پر غور کرنا چاہیئے۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے الفوز الکبیر میں صراحت کے ساتھ فرمایا ہے!

محقق آنت کہ قصداً اصلی از نزول قرآن مجید کے نزول کا اصلی مقصد انسانوں کی تہذیب بشر است و در ہم شکستن قرآن تہذیب و تربیت اور ان کے عقائد باطلہ و اعمال ایشاں۔

شاہ صاحبؒ نے اسی مفہوم کو تفہیمات میں اس طرح ادا کیا۔

”اللہ تعالیٰ نے مجھ کو تفسیر کا علم مختصر الفاظ میں عنایت فرمادیا، جس کی حقیقت یہ ہے کہ ایمان حقیقی ہر انسان کے قلب کے اندر ودیعت ہے لیکن مادی زندگی کی سرستیوں نے انسان پر قبضہ پالیا پس اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید نازل فرمایا تاکہ اس کے ذریعہ سے ان کی طبیعتوں کو مغلوب فرمائے“

(ج-۲- ص ۱۲۲ و ۱۲۳)

مطلب یہ ہے کہ قرآن مجید کا اصل موضوع یہی ہے کہ عباد اور معبود کے رشتے کو صحیح اصولوں پر استوار کیا جائے اور دنیاوی زندگی کو اخروی زندگی کی بنیاد بنایا جائے۔

اب کس قدر ستم ہے کہ لوگ قرآن مجید میں قدیم و جدید فلسفہ کے مباحث ہیئت کے مسائل، سائنس کے کثمنوں اور تاریخ و جغرافیہ کے نکات کی تلاش و جستجو کرتے ہیں اور اسی اعتبار سے قرآن کی صداقت اور اسی معیار سے اس کی عظمت کو جانچنا چاہتے ہیں! ہم کو اس سلسلہ کے ضمنی فوائد سے انکار نہیں لیکن ظاہر ہے کہ یہ چیزیں قرآن کا موضوع نہیں ہیں اور اس کا مقام تو اس سے کہیں ارفع و اعلیٰ ہے۔ بے شبہ قرآن مجید نے کائنات اور اس کے حوادث سے تعرض کیا ہے مگر اس کی نوعیت کیا ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ فرماتے ہیں:-

”قرآن مجید علوم طبعیہ کا بھی ذکر فرماتا ہے لیکن فلسفی اور صاحب قرآن

کے نقطہ میں فرق ہے مثلاً ایک طبیب جانوروں کو دیکھتا ہے تو وہ ان کے خواص پر غور کرتا ہے اور صاحب دولت جب جانوروں کو دیکھتا ہے تو وہ سوچتا ہے کہ ان میں سے سواری کے لائق کون ہے اور بار برداری کے قابل کون ہے؟ اسی طرح صاحب قرآن بھی کائنات سے تعرض کرتا ہے مگر اس کا مقصود اللہ کی قدرت اور اس کے علم و حکمت کا اظہار ہوتا ہے اس کے سوا اور کچھ مقصود نہیں ہوتا ہے۔ (سطحات ص ۱۲)

یہ تو دنیاوی علوم کا مسئلہ ہے۔ شاہ صاحب کو تو اس باب میں ان لوگوں سے بھی شکوہ ہے جو خالص دینی علوم میں اس قدر غلو کرتے ہیں کہ مقصود ان سے گم ہو جاتا ہے، قصص قرآن کے سلسلہ میں فرماتے ہیں۔

”قرآن مجید نے جن قصص کو بیان فرمایا ہے، ان کے صرف ضروری حصوں کا ذکر کیا ہے ان کے تمام اجزاء کے ذکر سے احتراز کیا ہے۔ اس کی حکمت یہ ہے کہ اگر پورا واقعہ بیان کیا جائے تو وہ لوگ ان واقعات میں پڑ جاتے ہیں اور عبرت پذیری جو مقصود اصلی ہے اس سے غافل ہو جاتے ہیں اس لئے قرآن نے ان ضروری حصوں کو لیا۔ باقی کو چھوڑ دیا۔ ایک عارف نے کہا ہے کہ جب سے لوگ تجوید و قواعد میں (غلو کے ساتھ) لگے تلاوت قرآن میں خشوع باقی نہ رہا اور جب سے اہل تفسیر نے تفسیروں میں دوران کار بخون کو چھیڑا فن ختم ہو گیا۔“ (الفوز الکبیر)

قرآن مجید کے طالب علم کو اس سلسلہ میں بہت محتاط رہنا چاہئے۔ اور اسکی نظر قرآن کے اصل موضوع پر رہنا چاہئے۔ تاکہ گوہر مقصود ہاتھ آجائے۔

قرآن مجید کے الفاظ کی تشریح کیلئے سب سے بہتر طریقہ یہ ہے کہ سب سے پہلے قرآن اس کے بعد سنت اور پھر اقوال صحابہ و تابعین کی طرف رجوع کیا جائے۔

قرآن عربی زبان میں ہے اس لئے بے شبہ قرآن کے الفاظ کی تشریح کے سلسلہ میں لغت عربیہ چارہ نہیں اس سانی اہمیت کو تسلیم کرنے ہوئے بھی یہ امر قابل لحاظ ہے کہ قرآن کی کچھ خود اپنی اصطلاحات ہیں اور ان کو کتاب و سنت ہی سے حل کیا جاسکتا ہے، مثلاً سورہ فاتحہ میں لفظ ”صراط مستقیم“ ہے، لغت میں جس کے معنی ”سیدھے راستے“ کے ہیں۔ مگر قرآن صراط مستقیم کے لفظ سے کونسا سیدھا راستہ مراد لیا ہے؟ اس کی تشریح بعد کو خود ہی فرما دی۔ یعنی

صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ان کا راستہ جن پر آپ نے انعام کیا ہے۔

انعام کن لوگوں پر ہوا ہے؟ اس کی تشریح بھی دوسرے موقع پر فرمادی گئی۔

وَمَنْ يُطِيعِ اللَّهَ وَالرَّسُولَ فَأُولَٰئِكَ مَعَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ مَنِ ان کے ساتھ ہے جن پر اللہ نے انعام کیا النَّبِيِّينَ وَالصِّدِّيقِينَ وَالشُّهَدَاءِ کہ وہ نبی اور صدیق اور شہید اور نیک وَالصَّالِحِينَ۔ بخت ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ ”صراط مستقیم“ سے مراد انبیاء و صدیقین، شہید اور صالحین کا راستہ ہے۔

اسی طرح سورہ آل عمران کے آخر میں فرمایا کہ زمین و آسمان کی پیدائش اور شب و روز کے اٹھ پھیر میں پختہ عقل والوں کے لئے نشانیاں ہیں۔ قرآن مجید نے اس

موقع پر پختہ عقل والوں کے لئے اولوالالباب کا لفظ استعمال کیا ہے قرآن کے نزدیک اولوالالباب کو کون لوگ مراد ہیں؟ اس کی تشریح میں ارشاد فرمایا کہ اولوالالباب وہ لوگ ہیں جو اٹھتے بیٹھتے ہر حال میں خدا کو یاد کرتے ہیں۔

قرآن مجید میں عبادات کے سلسلے میں، صلوٰۃ، زکوٰۃ، صوم، حج کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ لغت میں صلوٰۃ کے معنی دعا کے ہیں۔ زکوٰۃ کے معنی بڑھنے کے، صوم کے معنی قصد کرنے کے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان الفاظ کے معنی یہاں مقصود نہیں ہیں بلکہ ان میں سے ہر لفظ کا خاص مفہوم مراد ہے اور اس مفہوم کی تعیین سنت کرتی ہے اگر تعیین کو نہ مانا جائے اور صرف لغت کو سامنے رکھا جائے تو عبادات کی کوئی حیثیت باقی نہیں رہ سکتی ہے۔ اسی لئے حافظ ابن قیمؒ نے فرمایا۔

”قرآن مجید کا ایک خاص عرف ہوتا ہے اور اس کے کچھ متعین معنی ہوتے ہیں اور اس عرف سے ہٹ کر قرآن کی تفسیر جائز نہیں۔“

(التفسیر النقیم ص ۲۶۹)

اس زمانے میں قرآن مجید کے سمجھنے کے جو دردناک اور تکلیف دہ مناظر سامنے آتے ہیں ان میں سے ایک روح فرسا منظر یہ بھی ہوتا ہے کہ عربی زبان کی چند ریڈریں پڑھ کر لوگ اپنے کو فہم قرآن اور اس سے استنباط و استناد کا جائز حق دار جاننے لگتے ہیں۔ یہ سخت جرات کی بات اور انتہائی غیر ذمہ دارانہ اقدام ہے۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ اپنے رسالہ ”اصول تفسیر“ میں تفسیری غلطیوں کے سلسلے میں لکھتے ہیں۔

”دوسرے وہ لوگ ہیں جنہوں نے قرآن کی تفسیر محض لغت عرب سے کی ہے اور یہ لحاظ نہیں کیا کہ متکلم قرآن کی کیا مراد ہے اور اس نے جس پر قرآن نازل ہوا، کیا مطلب بیان

فرمایا ہے۔“ اور وہ لوگ جو قرآن کے اولین مخاطب تھے کیا سمجھتے تھے؟ (صفحہ ۶)

علامہ قرطبیؒ نے اپنی تفسیر ”الجامع لاحکام القرآن“ میں فرمایا۔

”جو شخص سماع اور نقل کی مدد لئے بغیر محض عربیت کی بنا پر قرآن کی تفسیر

کرے گا اس سے بہت غلطیاں ہوں گی اور وہ تفسیر بالزلّے کا مرتکب ہوگا۔“

قرآن مجید کے الفاظ کی تفسیر و توضیح و تشریح کیلئے لغت عرب کے ساتھ ساتھ قرآن مجید

کے عرف اسکی اصطلاحات اور جناب محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تشریحات کا علم

ضروری ہے۔ ورنہ نتائج بے حد خطرناک ہیں۔

اس موقع پر مولانا انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی حسب ذیل ہدایت زیادہ لائق

توجہ ہے۔

”مفردات میں قرآن مجید وہ کلمہ اختیار فرماتا ہے جس سے ادنیٰ بالحقیقہ واوئی

بالمقام تقلین نہیں لاسکتے، مثلاً جاہلیت کے اعتقاد میں موت پر توفی کا

اطلاق درست نہ تھا۔ کیونکہ ان کے اعتقاد میں نہ بقاء جسد فی اور نہ بقاء

روح، توفی، وصول کرنے کو کہتے ہیں ان کے عقیدہ میں موت توفی نہیں

ہو سکتی ہے۔ قرآن مجید نے توفی کا لفظ اطلاق کیا اور بتلایا کہ موت سے وصول

یابی ہوتی ہے نہ فنا محض، اس حقیقت کو ایک کلمہ سے کشف کر دیا اور کہیں

اس لفظ کا اطلاق اپنے اصلی معنی سے مع الروح کے وصول کرنے پر کیا۔“

شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ارشاد کا حاصل یہ ہے کہ قرآن مجید جس موقع پر جو لفظ

لے جناب مولانا احمد علی صاحب مرحوم کے حواشی قرآن پر حضرت شاہ صاحب نے جو تقریظ لکھی ہے

استعمال فرماتا ہے وہ موقع اور ادائے مطلب کے لحاظ سے حیرانم ہوتا ہے، بسا اوقات ایک لفظ پورے ایک مسئلہ کا حامل ہوتا ہے اس لئے الفاظ قرآن کے معنی کی تعیین و تشریح میں بے حد احتیاط کی ضرورت ہے۔

(۶)

قرآن مجید کی آیات کے مفہوم کی تعیین میں بھی یہ اصول پیش نظر رہنا چاہیے کہ بہترین طریق کاری یہ ہے کہ آیات قرآنی کی تشریح قرآن اور اس کے بعد سنت اور اقوال صحابہ تابعین سے کی جائے۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ نے فرمایا۔

”تفسیر کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ قرآن کی تفسیر خود قرآن سے کی جائے۔ قرآن میں جو مضمون ایک جگہ مجمل ہے، دوسری جگہ مفصل ملے گا۔ اور جہاں اختصار سے کام لیا گیا ہے دوسری جگہ اس کی تفصیل ملے گی اور اگر اس میں کامیاب نہ ہو سکو تو سنت کی طرف رجوع کرو۔ جو قرآن کی شرح اور تفسیر کرتی ہے بلکہ امام ابو عبد اللہ محمد بن ادریس الشافعیؒ نے تو یہاں تک فرمادیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی جو حکم دیا ہے وہ قرآن ہی سے ماخوذ ہے۔

(اصول تفسیر صفحہ ۹۲)

قرآن مجید کی آیات متشابہ یعنی ملی جلی ہوتی ہیں۔ ایک دوسرے کی تصدیق و تائید کرتی ہیں۔ ارشاد فرمایا۔

اللَّهُ نَزَّلَ أَحْسَنَ الْحَدِيثِ كِتَابًا مُتَشَابِهًا مَثَابًا ۚ
اللہ نے اناری بہتر بات کتاب آپس میں ملی
دھرائی ہوئی۔

حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے اس مفہوم کو ان الفاظ میں ادا فرمایا ہے۔

آیات قرآن متشابہ اند بعض آں مصدق
است و آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
مبین قرآن عظیم است،
اور صلی مفسر قرآن عظیم کے آنحضرت صلی
اللہ علیہ وسلم ہیں۔
(ازالۃ الخفا مقصد اول فصل سوم)

اسلئے ہر آیت کا وہ مطلب مراد لینا چاہیے جس کی تائید دوسری آیت و سنت سے ہوتی ہے۔ اگر اس اصول کی رعایت نہ کی جائے گی، تو قدم قدم پر لغزش کا اندیشہ ہے، مثلاً سورہ بقرہ میں یہود کے باب میں فرمایا گیا ہے کہ یہ دنیا میں ہمیشہ ذلیل و رسوا رہیں گے۔ ارشاد ہوا۔

وَضَرَبْتُ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةَ وَالْمَسْكَنَةَ وَ
أَوَّلُ يَغْضَبُ مِنَ اللَّهِ - (بقرہ)
اور ڈالی گئی ان پر ذلت اور رسوائی اور پھر اللہ
کا غضب لے کر۔

لیکن ادھر جب سے اسرائیل کی حکومت قائم ہوئی اور یہود کو ایک وطن ملا اس وقت سے برابر استفسارات ہوتے رہتے ہیں کہ قرآن نے تو یہود کے متعلق ذلت و رسوائی کی پیشگوئی فرمادی تھی اب یہود کیسے اقتدار کے مالک بن گئے؟ حالانکہ سورہ آل عمران میں اسکی تفصیل موجود ہے وہاں فرمایا۔

ضَرَبْتُ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةَ أَيْنَ مَا تَفَقَّوْا إِلَّا
يَحْضِلُ مِنْهُمُ اللَّهُ وَجْهٌ مِنَ النَّاسِ (آل عمران ۱۲)
ماری گئی ان پر ذلت جہاں پائے جائیں سوا
دستاویز اللہ کے اور دستاویز لوگوں کے۔

اس آیت میں واضح فرمادیا گیا کہ یہود کو ذلت و رسوائی سے بچنے کی دو ہی صورتیں ہیں وہ یا اسلام قبول کریں یا دنیا میں کسی دوسرے کی سرپرستی قبول کریں۔ مطلب یہ ہے کہ دوسروں کے سہارے کے بغیر وہ قومی عزت کے مالک نہیں بن سکتے۔ اب بنی اسرائیل کی حکومت کا قیام

لَا يَحْضِلُ مِنَ اللَّهِ - کی بعض دوسری تفسیریں بھی کی گئی ہیں۔ ۱۲

خود یہود کا بہن منت ہے یا ساحران فرنگ کی ادنیٰ ساحری کا نتیجہ ہے۔ یہ سب کو معلوم ہے۔
اس طرح سورۃ آل عمران کی اس تشریح کے بعد سورۃ بقرہ کی آیت بحث طلب باقی نہیں رہتی
ہے۔ اسی طرح سورۃ مائدہ کی آیت۔

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا وَالصَّابِئُونَ وَالنَّصَارَىٰ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا (ع)
بے شک جو مسلمان ہیں اور جو یہود کا ہیں اور
فرقہ صابئی اور نصاریٰ پر جو کوئی ایمان لائے،
اللہ پر اور روز قیامت پر اور عمل کرے نیک۔
کے متعلق اس زمانہ میں یہ بحث پیدا ہو گئی کہ نجات کیلئے صرف اللہ پر ایمان کافی ہے،
بیغیروں پر فرشتوں اور آسمانی کتابوں پر ایمان لانا ضروری نہیں ہے، اس لئے کہ آیت مذکورہ
میں صرف ایمان باللہ اور ایمان بالیوم الآخر کا ذکر ہے یہ بحث نتیجہ اسی غلط روی کا ہے کہ آیت
قرآنی کی تشریح میں دوسری متعلقہ آیات پر نظر نہیں کی جاتی۔

صورت تو یہ ہے کہ رسولوں پر ایمان کے انکار کو قرآن نے کفر قرار دیا ہے ارشاد ہوا:-
إِنَّ الَّذِينَ يَكْفُرُونَ بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ
وَيُرِيدُونَ أَنْ يُفَرِّقُوا بَيْنَ اللَّهِ
وَرَسُولِهِ وَيَقُولُونَ نُؤْمِنُ بِبَعْضِ
وَنَكْفُرُ بِبَعْضٍ وَيُرِيدُونَ أَنْ
يَتَّخِذُوا بَيْنَ ذَلِكَ سَبِيلًا ۝
جو لوگ منکر ہیں اللہ کے اور اس کے رسولوں
کے اور چاہتے ہیں کہ فرق نکالیں اللہ
اور اس کے رسولوں میں اور کہتے ہیں ہم
لمنتے ہیں بعضوں کو اور نہیں مانتے ہیں
بعضوں کو اور چاہتے ہیں کہ نکالیں اس
کے بیچ میں ایک راہ ایسے لوگ وہی ہیں
(نساء - ۲۱)

اصل کافر۔

اس صریح ارشاد کے بعد سورۃ مائدہ کی آیت سے رسالت وغیرہ پر ایمان کو غیر ضروری

کیسے قرار دیا جاسکتا ہے اصل یہ ہے کہ سورۃ مائدہ کی آیت محل ہے مقام اجمال میں صرف
ایمان باللہ اور ایمان بالیوم الآخر کا ذکر کیا جاتا ہے اور مقام تفصیل میں پورے سلسلہ ایسا نیات
کا اظہار فرمایا جاتا ہے چنانچہ سورۃ تغابن میں تفصیل و اجمال دونوں کی مثالیں موجود ہیں چنانچہ
ایسا نیات کی وضاحت کرتے ہوئے ارشاد ہوا۔

فَآمِنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَالشُّورِ
الَّذِي أَنْزَلْنَا بِاللَّهِ بِمَا
تَعْمَلُونَ خَبِيرُهُ يَوْمَ يَجْمَعُكُمْ
لِيَوْمِ الْجَمْعِ ذَلِكَ يَوْمُ التَّغَابُنِ
سو ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر اور
اس نور پر جس کو ہم نے اتارا ہے اور اللہ کو
تمہارے سب کام کی خبر ہے جس دن تم کو اکٹھا
کرے گا جمع ہونے کے دن۔ وہ دن ہے
(تغابن - ۱)

ہر جیت کا۔

اس آیت میں اللہ اور رسول، قرآن اور قیامت، سب پر ایمان لانے کا حکم دیا ہے
اور اسی کے بعد جب پورے مجموعے کی طرف ارشاد کرنا منظور ہوا تو بے طور اجمال فرمایا۔
وَمَنْ يُؤْمِنْ بِاللَّهِ وَيَعْمَلْ صَالِحًا
جو کوئی یقین لائے اللہ پر اور کام کرے بھلا۔
(تغابن - ۱)

یہ تو صرف دو مثالیں ہیں جن کے ذریعہ یہ دکھلانا مقصود ہے کہ آیات قرآنی کی
تشریح و تاویل میں دوسری آیات پر نظر رکھنا کس قدر ضروری ہے؟ اور اس سے یہ بات
بھی ظاہر ہو گئی کہ آیات قرآنی کے مفہوم کے تعین کیلئے محض عربی زبان کی واقفیت کافی نہیں
ہے بلکہ مسائل قرآن پر غائر نظر ہونے کی ضرورت ہے اس لئے فہم قرآن کے ہر سرائی کا دعویٰ
قبول نہیں ہو سکتا ہے، جو لوگ تراجم کی مدد سے قرآن مجید سے نفع اٹھانا چاہتے ہیں ان
کی خدمت میں بھی عرض ہے کہ کسی واقف کار کی مدد سے یا کسی معتبر حاشیہ یا مستند تفسیر کے

ساتھ قرآن کا ترجمہ پڑھیں ورنہ محض ترجمہ کا مطالعہ مفرت کے اندیشہ سے خالی نہیں ہے اس لئے کہ ترجمہ میں ناسخ، منسوخ، جمل مفصل، مطلق، مقید اور نزول آیات کے پس منظر وغیرہ کا کوئی ذکر نہیں ہوتا ہے اور ان چیزوں کے علم کے بغیر صحیح مفہوم اور مقصد تک سائی ممکن نہیں ہے۔

(۷)

قرآن مجید کے الفاظ کی تشریح اور آیات کے مفہوم کی تعیین کے سلسلہ میں ارشادات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اور اقوال صحابہ و تابعین کا ذکر آیا ہے اس لئے ضروری ہے کہ تفسیر کے روایتی حصے کے متعلق بھی کچھ عرض کر دیا جائے۔ تفسیری روایات کے متعلق عجیب افراط و تفریط کا معاملہ ہے اگر ایک طرف کچھ ایسے لوگ موجود ہیں جو تحقیق و تنقید کے بغیر کتب تفاسیر میں نقل کی ہوئی ہر روایت پر ایمان لانے کیلئے تیار ہیں تو دوسری طرف ایسے لوگ بھی ہیں جو تفسیر کے پورے روایتی حصہ کو شک اور شبہ کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ حق ان دونوں میں سے کسی کے ساتھ نہیں ہے۔ صحیح راستہ درمیان کا ہے یعنی محدثین نے روایات کی تحقیق و تنقید کے جو اصول مرتب فرمائے ہیں ان پر جو روایات پوری اُتریں وہ قبول کی جائیں ورنہ رد کر دی جائیں۔

تاریخی حیثیت سے تفسیری آثار و روایات کے تین دور قائم ہو سکتے ہیں۔

(۱) پہلا دور حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا ہے جن کو بارگاہ نبوت سے براہ راست فہم قرآن کا موقع ملا۔ ہر چند کہ حضرات صحابہ عموماً اہل عرب تھے اور انہیں کی زبان میں قرآن نازل ہوا تھا، مگر یہ فہم قرآن میں اپنے کو رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا پابند اور محتاج سمجھتے تھے، کوئی لفظ یا آیت ان بزرگوں کی سمجھ میں نہ آتی تو حضور سے دریافت فرماتے

خود سرور کونین (صلی اللہ علیہ وسلم) آیات کی توضیح و تشریح فرمادیا کرتے تھے، اکابر صحابہ اپنی علمی مجلسوں میں بھی قرآن مجید کے متعلق بہت سے نکتے حل فرماتے قرآن کے غریب الفاظ کی شرح میں دیوان عرب سے کام لیتے۔ احکام قرآن پر غور فرماتے۔ مسائل کا استنباط کرتے، شان نزول بیان فرماتے۔ اگر کسی کو غلط معنی اخذ کرتے یا بیان کرتے ہوئے دیکھتے تو اس کی اصلاح فرمادیتے۔

صحابہ کرام میں دس حضرات کو اس فن میں خاص امتیاز حاصل تھا۔

خلفائے راشدین، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت ابی بن کعب، حضرت زید بن ثابت، حضرت ابو موسیٰ اشعری، حضرت عبداللہ بن زبیر، (رضی اللہ عنہم اجمعین)

ان حضرات کے سوا حضرت انس، حضرت ابو ہریرہ، حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت جابر، حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص سے بھی تفسیری روایات مروی ہیں مگر بہت کم، حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص کی روایات زیادہ تر قصص اور اخبار و فتن سے متعلق ہیں۔

خلفائے راشدین میں سب سے زیادہ تفسیری روایات حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ہیں۔ حضرت علیؑ کے بعد حضرت عبداللہ بن عباس کی طرف منسوب ہیں۔ یہ صحابہ میں ایک تفسیری مجموعہ کا انتساب حضرت ابی بن کعبؓ کی طرف ہے۔ اس سے ابن جریر طبری نے بکثرت اخذ کیا ہے۔ حاکم نے مستدرک میں نیز امام احمد بن حنبلؓ نے بھی اس سے اخذ کیا ہے۔

صحابہ کرام کے بعد تابعین کا دور آتا ہے اس دور میں مکہ اور کوفہ تعلیم قرآن کے لئے خاص اہمیت رکھتے ہیں۔

مکہ معظمہ میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے تلامذہ حضرت مجاہدؒ (۲۱۱ھ) حضرت سعید بن جبیرؒ (۹۴ھ) حضرت عکرمہؒ (۱۰۷ھ) حضرت طاؤسؒ (۱۱۷ھ) حضرت عطاء بن رباحؒ (۱۱۷ھ) کا فیض جاری تھا اور کو فیض حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے تلامذہ حضرت علقمہ بن قیسؒ (۱۱۷ھ) حضرت اسود بن یزیدؒ (۱۱۷ھ) حضرت ابراہیم نخعیؒ (۱۱۷ھ) اور امام شافعیؒ (۱۵۰ھ) خدمت دین میں مصروف تھے۔

ان حضرات کے سوا اس عہد کے شاہیر حضرت حسن بصریؒ (۱۱۰ھ) عطاء بن ابی سلم خراسانی، محمد بن کعب القرظیؒ (۱۱۷ھ) ابو العالیہ رفیع بن مہران الرباحیؒ (۱۱۷ھ) فحاک بن مزاحمؒ (۱۱۷ھ) عطیہ بن سعید الحوفیؒ (۱۱۷ھ) قتادہ بن دعامہؒ (۱۱۷ھ) ابومالکؒ زید بن سلم، ربیع بن انس، مرہ ہمدانیؒ (۱۱۷ھ) کے نام قابل ذکر ہیں۔

صاحب کشف الظنون نے جن کتب تفسیر کا ذکر کیا ہے ان میں سے حضرات تابعین کی طرف جن کا انتساب ہے وہ یہ ہیں :-

(۱) تفسیر عکرمہ (۲) تفسیر عوفی (۳) تفسیر مجاہد (۴) تفسیر والبی (۵) تفسیر زید بن سلم، ابن الوزیری نے ایثار الحق میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے شاگرد علی بن طلحہ یاشعی کی تفسیر نیز تفسیر امام حسن بصریؒ، تفسیر عطاء بن رباحؒ، تفسیر محمد بن کعب القرظیؒ کا ذکر کیا ہے۔

علی بن طلحہ کی تفسیر کے متعلق حافظ ابن حجر کا بیان ہے کہ اس کا ایک نسخہ امام لیث کے کاتب شیخ ابوصالح کے پاس تھا۔ امام احمد بن حنبلؒ فرماتے ہیں کہ یہ نسخہ مصر میں ہے، اگر کوئی محض اس کیلئے مصر کا سفر کرے تو یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے اس صحیفہ سے ابو جعفر نخاس (۳۸ھ) نے اپنی کتاب النسخ والنسخہ میں کافی اخذ کیا ہے۔ ابن جریر

نے اپنی تفسیر میں اس سے تخریج کی ہے۔

حضرت سعد بن جبیر کی طرف بھی ایک تفسیر منسوب ہے جو تفسیر عطاء بن دنیار کے نام سے مشہور ہے۔ اس دور کی تفسیری کوششوں کے متعلق اُمور ذیل لائق توجہ ہیں۔

(۱) اس دور کی تفسیر کا بڑا سرمایہ حضرات صحابہ کرام کی روایات اور ان کے اقوال ہیں خود تابعین بھی تلاش و تفحص اور اجتہاد نیز استنباط مسائل سے کام لیتے تھے، قرآن کے متعلق ان کی لغوی تشریحات کو امام بخاریؒ نے اپنے صحیح میں جمع کر دیا ہے۔

(۲) حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے تلامذہ میں مجاہد کا بڑا مرتبہ ہے۔ حافظ ابن تیمیہ کا بیان ہے۔

”مجاہد کی تفسیر پر اکثر ائمہ مثلاً ثوری، امام شافعی، احمد بن حنبل اور بخاری اعتماد کرتے تھے۔ امام ثوری کا بیان ہے کہ اگر تم کو کوئی تفسیر مجاہد سے ملے تو بس کافی ہے۔“

(تفسیر سورۃ اخلاص صفحہ ۹۴)

(۳) حضرت مجاہد کی عظمت اور جلال علم کے باوجود ان کے دو اقوال کو ائمہ اہل تفسیر نے قبول نہیں کیا ہے۔ ایک مقام محمود کی تفسیر دوسرے اِلٰی رَبِّہَا نَا ظِرَّةٌ کی تفسیر۔ (۴) صاحب فخر الاسلام نے طبقات ابن سعد (جز ۵ ص ۳۴۴) کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ بعض اہل علم کو مجاہد کے اقوال قبول کرنے میں نااہل تھا، مگر اسی مقام پر خود ہی صنف فخر الاسلام نے کہا ہے کہ

”مجاہد کے صدق میں ہم کسی کو مترد نہیں پاتے۔“

سے مرقۃ المفہر ص ۱۱۳ ۱۱۴ میزان الاعتدال ترجمہ عطاء بن دنیار ۱۲ ۱۳ تفسیر روح المعانی (سورۃ اسراء) آیت

(عشراں میبک ربک الخ) ۱۱۳ ۱۱۴ فخر الاسلام ج ۱ ص ۲۵۲

(۵) حضرت مجاہد کو حضرت عبداللہ بن مسعود کی قرأت سے بھی بڑی مدد ملی وہ فرماتے تھے کہ حضرت ابن عباس سے استفسارات سے قبل اگر میں نے عبداللہ بن مسعود کی قرأت کو پڑھا ہوتا تو بہت سے سوالات کی ضرورت نہ پڑتی۔ (الروض الانف ج اول صفحہ ۲۲۰)

(۶) حضرت عبداللہ بن عباس کی طرف جو تفسیری روایات منسوب ہیں ان میں سے بعض سندوں میں انقطاع پایا جاتا ہے مگر فی نفسہ وہ معتبر ہیں۔ حافظ ابن تیمیہ نے اس سلسلے میں حسب ذیل نام لئے ہیں۔

سُدی، کبیر، ضحاک، علی بن ابی طلحہ والہی، قتادہ۔

اور بعض سندیں ایسی ہیں جن میں ضعف پایا جاتا تھا۔ مثلاً۔

(۱) جویر بن سعید عن الضحاک عن ابن عباسؓ اس سند میں جویر ضعیف راوی ہیں۔

(۲) عبید اللہ بن سلیمان عن الضحاک عن ابن عباسؓ اس سند میں عبید اللہ ضعیف

راوی ہیں۔

(۳) محمد بن سعد العوفی عن آباء عن عطیۃ العوفی عن ابن عباسؓ اس سند میں عطیہ

ضعیف راوی ہے۔

محمد السائب الکلبی، عن ابی صالح بازام عن ابن عباسؓ، اس سند میں بازام ضعیف

اور کلبی کذاب ہے۔

ابن عساکر نے اپنی تاریخ میں کہا ہے کہ

کلبی کی کتاب التفسیر اس لائق ہے کہ اس کو دفن کر دیا جائے۔ ج۔ ص ۱۱۶

حافظ ابن تیمیہ فرماتے ہیں۔

کلبی، سدی، صغیر اور مقاتل بن سلیمان متروک ہیں۔

یہی بات صاحب کشف الظنون نے بھی کہی ہے۔

حضرات تابعین کے بعد منبع تابعین کا دور آتا ہے ان کا اصل کارنامہ اقوال صحابہ و تابعین کا جمع کرنا اور ان کی اشاعت ہے۔ دوسری روایات کو بھی انہوں نے جمع کیا ہے لیکن جرح و تنقید سے الگ ہے۔ (الامام شافعی رحمہ اللہ)

اس سلسلے میں قابل ذکر حضرات یہ ہیں۔

سفیان بن عیینہ (۱۹۸ھ) وکیع بن الجراح (۱۹۶ھ) شعبہ بن الحجاج (۱۶۸ھ)

اسحاق بن راہویہ (۳۱۵ھ) یزید بن ہارون اسلمہ (۳۱۵ھ) عبدالرزاق بن ہمام (۳۱۱ھ)

آدم بن ابی ایاس (۳۱۵ھ) روح بن عبادہ (۳۰۵ھ) سید بن داؤد (۳۲۲ھ) ابوبکر بن

ابی شیبہ (۳۲۵ھ) عبد بن حمید (۳۲۹ھ) ابن وہب (۳۹۹ھ)۔

اس دور میں تفسیری دائرے کو بہت وسعت ہوئی، بہ کثرت روایات کا سلسلہ پھیلا صاحب کشف الظنون نے جن تفسیروں کا ذکر کیا ہے ان میں سے ذیل کی تفسیریں اس دور کی ہیں۔

(۱) تفسیر ابن جریج (۱۵۵ھ) (۲) تفسیر مقاتل (۱۵۵ھ) (۳) تفسیر آدم بن ابی ایاس

(۲۲۵ھ) (۴) تفسیر شعبہ بن الحجاج (۳۱۵ھ) (۵) تفسیر عبدالرزاق بن ہمام (۳۱۱ھ) (۶)

تفسیر عبد بن حمید (۳۲۹ھ) (۷) تفسیر وکیع بن الجراح (۳۱۵ھ) (۸) تفسیر یزید بن ہارون (۳۱۱ھ)

(۹) روح بن عبادہ کے متعلق تہذیب میں جمع تفسیر کا ذکر ہے (۱۰) ابوبکر بن ابی شیبہ کی تفسیر

کا ذکر خطیب کرتے ہیں۔ (۱۱) سید بن داؤد کو بھی صاحب تفسیر مانا جاتا ہے (۱۲) تفسیر سفیان ثوری

(۳۹۹ھ) (۱۳) تفسیر امام مالک رحمہ اللہ۔

تفسیر امام مالک کے متعلق شک ہے کہ یہ خود امام صاحب کی تالیف ہے یا کسی شاگرد نے

لے مآۃ التفسیر لکھ کتب خانہ راہپور میں موجود ہے ۳۵ حیات امام مالک صفحہ ۶۸۔

امام صاحب اس کی تعلیق کی ہے۔

ان تمام تفسیروں کے متعلق یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ ان میں سے کوئی مجموعہ بہ ترتیب مصنف تمام قرآن کی تفسیر نہ تھا بلکہ صورت یہ تھی کہ جس کے پاس جو تفسیری روایات تھیں وہی تفسیری مجموعہ کی شکل میں آگئیں ہمارے سامنے بہ ترتیب مصنف قرآنی کی پہلی اور جامع تفسیر ابن جریر کی ہے۔ ابن جریر نے تمام تفسیری ذخیروں کو جو ان کے عہد میں تحریری یا زبانی طور پر موجود تھے اپنی تفسیر میں جمع کر کے ان کو دست برد زلزلے سے محفوظ کر دیا چنانچہ ذیل کے مأخذ ان کی تفسیر کا اصل قرار پائے۔

(۱) کتب تفسیر مصنف عن عبداللہ بن عباس (۲) کتب تفسیر عن سعید بن جبیر (۳) مجاہد (۴) قتادہ بن دعامہ (۵) حسن بصری (عکرمہ) (۷) ضحاک بن مزاحم (۸) عبداللہ بن مسعود (۹) تفسیر عبدالرحمان بن زید السلم (۱۰) ابن جریر (۱۱) تفسیر مقاتل ، ان کتابوں کے سوا دوسری احادیث مشہورہ و مندرجہ بھی حسب ضرورت ذکر کی گئی ہیں۔

تفسیر ابی بن کعب اور تفسیر علی بن طلحہ کے متعلق اوپر ذکر آچکا ہے کہ ابن جریر نے ان کو اپنی تفسیر کا مأخذ بنایا ہے

تفسیری آیات و روایات کے یہ تین اہم دور تھے، جن کو اختصار کے ساتھ بیان کر دیا گیا ہے اس سلسلہ میں یہ بات ذہن نشین رہنا چاہئے کہ تفسیری روایات میں بھی حدیث کے عام قاعدہ کے مطابق سند کی بڑی اہمیت ہے اگر سند کے اعتبار سے کسی روایت میں نقص نہیں ہے تو اس کے قبول کرنے میں تامل نہ کرنا چاہئے اور اگر سندی حیثیت کمزور ہے تو وہ روایت اسی مرتبہ پر رکھنے کے لائق ہے جس کے وہ قابل ہے اسی لئے حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی نے

تفسیر ابن جریر کو جو کہ تفسیری روایات کا سب سے اہم ذخیرہ ہے کتب حدیث کے طبقہ چہارم میں رکھا ہے اور اس طبقہ کی کتابوں کیلئے فرمایا۔

”اگر کسی کو ان کتابوں کی تحقیق کا شوق ہو تو اس کو چاہئے کہ ان کے راویوں کا حال معلوم کرنے کیلئے ذہبی کی میزان الضعفاء اور ابن حجر عسقلانی کی میزان السنن سے رکھے اور غریب الفاظ کی شرح اور عبارتوں کے مفہوم متعین کرنے کیلئے محمد طاهر (گجراتی) کی مجمع البحار سے استفادہ کرے۔

(بحالہ نافعہ)

(۸)

قرآن مجید کی زبان عربی ہے اسلئے قرآن مجید سے استفادہ کرنے والے کے لئے عربی زبان کی واقفیت سے چارہ نہیں، لیکن یہ بات کبھی نہ فراموش کرنی چاہئے کہ زبان کے معاملہ میں قرآن مجید کا معیار اس قدر بلند ہے کہ علمائے اسلام کی ایک بڑی جماعت نے قرآن مجید کی فصاحت و بلاغت ہی کو اس کے اعجاز کی اصلی وجہ قرار دیا ہے، اسلئے قرآن مجید کے الفاظ اس کے جملوں اور اس کی ترکیبوں کے سلسلہ میں محض سطحی معلومات پر بھروسہ نہ کرنا چاہئے بلکہ عربی لغت اور اس کے اسالیب بیان کے اعلیٰ مأخذ کو پیش نظر رکھنا چاہئے تاکہ قرآن مجید کے مضامین سے صحیح استفادہ ہو سکے! اس سلسلہ میں حسب ذیل اشارات خاص طور پر لائق توجہ ہیں۔

(۱) قرآن مجید کے الفاظ کی تشریح کے لئے اہل علم نے دو طریقے اختیار کئے ہیں۔ بعض نے تمام الفاظ کا احاطہ کیا ہے اور ان کا نام مفردات القرآن رکھا ہے، مثلاً مفردات القرآن، امام راغب اصفہانی۔ ایک جماعت نے صرف شکل لغات پر اکتفا کیا اور اس کو

غریب القرآن کے نام سے موسوم کیا۔ اس فن پر علماء نحو و ادب نے کثرت سے کتابیں لکھی ہیں لیکن اس باب میں سب سے زیادہ کاوش و تلاش ابن درید (۲۱۷ھ) اور اُن کے شاگرد غزیری نے کیا ہے۔ ان دونوں استاد اور شاگرد نے غریب القرآن کی تدوین میں پورے پندرہ برس صرف کئے۔

(۲) قرآن میں اکثر ایک لفظ متعدد مقامات میں مختلف معنی رکھتا ہے۔ اہل بلاغت اس لفظ کو مشترک کہتے ہیں لیکن علوم قرآن میں اس کو ”نظار“ کہتے ہیں اور بعض الفاظ ایسے ہیں جو متعدد مقامات پر مستعمل ہوتے ہیں اور ہر جگہ ان سے ایک ہی معنی مراد ہیں علماء قرآن اس کو ”وجہ“ کہتے ہیں۔ ”وجہ و نظار“ کی واقفیت فہم معانی قرآن کیلئے نہایت ضروری ہے تاکہ معنی سمجھنے میں اشتباہ نہ ہو اس بنا پر علماء اسلام نے ”وجہ و نظار“ کی توضیح و تحقیق کیلئے مستقل کتابیں لکھی ہیں۔ حافظ جلال الدین سیوطی کا رسالہ ”معرک الاقرآن“ فی مشترک القرآن“ اسی فن میں ہے۔

(۳) عربی زبان میں اجزائے کلام کے باہمی ارتباط و تعلق کے اظہار کیلئے اعراب یعنی آخری حرف میں زیر، زبر، پیش، کا استعمال ہوتا ہے انہیں اعراب کے ذریعہ سے عربی زبان میں فاعل، مفعول، مضاف، مضاف الیہ حال، تمیز، وغیرہ کا امتیاز ہوتا ہے اسلئے ظاہر ہے کہ فہم معنی کیلئے اعراب کی واقفیت کی کس قدر ضرورت ہے، علمائے اسلام نے یہ ضرورت بھی پوری کر دی ہے قرآن مجید کے اعراب پر پیش کتابیں تصنیف کی ہیں جن میں عموماً ایک ایک سورہ کو بہ ترتیب لے کر ان کے اعراب کی تحقیق کی گئی ہے،

(۴) قرآن مجید جن مطالب پر مشتمل ہے اُن کو کُن طریقوں سے ادا کیا گیا ہے؟ اور اس سلسلہ میں کن مختلف صلات و حروف روابط کو استعمال کیا گیا ہے؟ یہ مختلف

صلات و حروف روابط معنی میں کیا اثر پیدا کرتے ہیں الفاظ کی تقدیم و تاخیر، تعریف و تنکیر، اطلاق و تقید وغیرہ سے معانی میں کیونکر اثر پیدا ہوتا ہے، ان تمام امور کی واقفیت کے بغیر قرآن کے مطالب سمجھنا غیر ممکن ہے اسلئے علمائے ادب نے جن کو اس موضوع پر قلم اٹھانے کا سب سے زیادہ حق تھا ان مباحث پر معانی قرآن کے نام سے بہ کثرت کتابیں لکھیں۔ قرآن کے طالب علم کو اس فن سے واقفیت ضروری ہے۔

(۵) جو لفظ جس معنی کیلئے بنایا گیا ہے، اگر اسی میں اس کا استعمال ہے تو اس کو حقیقت کہتے ہیں اور اگر اس عام اور معروف وضع کے ذریعہ سے اس کے مناسب اور غیر معروف معنی کو ادا کیا جائے تو اس کو مجاز کہتے ہیں۔ قرآن مجید میں بے انتہا مجازات ہیں اور مفسر کیلئے ان سے واقفیت ضروری ہے، مصنفین اسلام نے مجاز القرآن کے نام سے مستقل کتابیں لکھی ہیں۔ سلطان العلماء عز الدین بن عبدالسلام (۳۰۷ھ) کی الاشارة الی الایجاز فی بعض انواع المجاز اس فن کی بہترین تصنیف ہے جس میں نہایت استیعاب کے ساتھ ۱۷ صلات کا معانی پر جو اثر پڑتا ہے اس کا اندازہ آیت (وَإِذْ أَفْرَقْنَا بَيْنَكُمْ الْبَحْرَيْنِ) اور (وہ وقت یاد کرو) جب ہم نے تمہارے لئے سمندر کو بچا دیا تھا۔ (بقرہ) سے کرنا چاہیئے اس آیت پر ایک ظاہری اشکال یہ وارد ہوتا ہے کہ قرآن مجید اپنے عہد کے بنی اسرائیل سے کہہ رہا ہے کہ ہم نے تمہارے لئے دریا کو بچا دیا تھا حالانکہ یہ واقعہ ان کے اسلاف کے ساتھ پیش آیا تھا اس اشکال کے مناسب جوابات دیئے گئے ہیں لیکن صاحب روح المعانی نے کہہ دیا کہ اگر ”لکھو“ ہوتا تو اس سے عہد نبوی کے بنی اسرائیل مراد ہوتے اور ”ب“ سے حلہ یعنی ”بکہ“ کے معنی ہیں کہ تمہارے اسلاف کیلئے دریا بچھا دیا تھا۔ اس طرح محض حلہ کے فرق کے باعث کوئی اشکال نہیں وارد ہوتا ہے (روح المعانی ج اول ص ۲۱۷)

قرآن کی آیات کا استقصاء اور اس کے معانی کی تشریح کی گئی ہے۔

(۳) بہت معانی اور مطالب ایسے ہیں جو عام نظروں سے پوشیدہ ہیں اور جن کی تشریح و توضیح کیلئے ایک دفتر درکار ہوتا ہے لیکن سب سے آسان مختصر اور بہتر صورت اس کی یہ ہے کہ ان کو تشبیہ کے ذریعہ ادا کیا جائے یعنی ان کو ایسے معانی و مطالب کے مشابہ قرار دیا جائے جو عام طور پر معلوم ہیں اور نظروں کے سامنے ہیں، تاکہ مخاطب ان واضح اور ظاہر معانی سے بواسطہ مشابہت مخفی معانی تک پہنچ جائے۔ اسی کو تشبیہ کہتے ہیں۔

قرآن مجید نے بھی تشبیہات کا استعمال کیا ہے اور ان تشبیہات پر، عام کتب بیان نیز فن معانی القرآن، فن اعجاز القرآن اور فن مجاز القرآن میں کامل بحثیں موجود ہیں۔ جن کا مطالعہ طالب قرآن کے لئے ناگزیر ہے۔

(۴) قرآن مجید میں ایک ہی مادہ، مختلف ابواب سے استعمال ہوا ہے۔ ظاہر ہے کہ ابواب کا یہ تغیر کسی معنوی افادہ سے خالی نہیں

اس سلسلہ میں اصولی بات یہ ہے کہ الفاظ کی زیادتی و قوت کو معنی کی قوت اور اہمیت میں بہت ہی زیادہ دخل ہے جیسا کہ مصنف طراز فرماتے ہیں۔

”معنی میں زور و قوت کا جو ظہور ہوتا ہے وہ الفاظ کی وجہ سے ہوتا ہے اور الفاظ میں یہ قوت صیغوں کے رد و بدل کی وجہ سے آتی ہے اگر ایسا نہ ہو تو پھر الفاظ کی کمی زیادتی کا کوئی فائدہ ہی نہ ہوگا اس لئے معنی میں قوت پیدا کرنے کے لئے الفاظ کی زیادتی لازمی ہے۔“

مزید وضاحت کے لئے چند مثالیں درج ذیل ہیں۔

علام الغیوب اور عالم الغیوب میں بہت فرق ہے۔ علام زیادہ جاننے والے کو کہیں گے اور عالم صرف جاننے والے کو، اسی طرح یُحِبُّ التَّوَّابِينَ اور یُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِينَ میں جو توبہ بیان پایا جاتا ہے وہ تائبین اور طاہرین میں نہیں پایا جاتا کیونکہ تائب ہمہ وقت توبہ کرنے والے کیلئے مستعمل ہے اور تائب صرف توبہ کرنے والے کو کہتے ہیں۔“

(۱) ایک آیت ہے۔ فَمَا اسْتَطَاعُوا أَنْ يَظْهَرُوا وَمَا اسْتَطَاعُوا لَهُ نَقْبًا اس میں بھی الفاظ کی زیادتی سے معنی میں تبدیلی واقع ہو گئی ہے، کیونکہ ”ت“ حروف شدت میں سے ہے اور اسی وجہ سے یہ واضح ہو گیا کہ اہم مہم اور سخت کام کے لئے استطاع کا لفظ مستعمل ہوگا، اور آسان و سہل کام کے لئے استطاع۔ کیونکہ فَمَا اسْتَطَاعُوا أَنْ يَظْهَرُوا کے معنی یہ ہے کہ اپنے ضعف کی وجہ سے وہ اس پر غلبہ نہ کر سکے۔ اور وَمَا اسْتَطَاعُوا لَهُ نَقْبًا کے معنی یہ ہیں کہ شدت اور سختی کی وجہ سے وہ سوراخ نہ کر سکے۔

(۲) دوسری آیت عَلِمَ اللَّهُ أَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُونِ أَنْفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنْكُمْ میں ”تختانون“ کا باب افتعال سے آنا بہت ہی پر معنی ہے۔ بظاہر آیت صرف یہ بتا رہی ہے کہ صحابہ کرام (نحوذ باللہ) خیانت کے مرتکب ہوتے تھے لیکن فرق ضالہ نے تو اسی آیت کو لے کر صحابہ کرام کے خلاف طعن و تشنیع کی ایک

مہم شروع کر دی۔ لیکن جب لغت پر نظر ڈالی گئی تو قرآن کے اعجاز کا قائل ہونا پڑا کیونکہ اختیان کہنے میں خیانت کا ارادہ کرنے کو! یعنی خیانت کے خیال اور تصور کو اختیان کہا جاتا ہے اور خیانت کرنے کے معنی میں جو لفظ مستعمل ہوتا ہے وہ یَخُونُونَ ہے نہ کہ يَخْتَانُونَ اور خیانت کا تصور و خیال کوئی بڑی بات نہیں ہے کیونکہ اللہ عزوجل نے فرمایا ہے إِنَّ التَّفَقُّسَ لَا مَآرَءَ بِالسُّوءِ (نفس ہی برائیوں کی طرف کثرت سے راغب کرتا ہے۔)

حاصل یہ کہ قصد فعل دوسری چیز ہے اور صدور فعل دوسری چیز! قرآن مجید کا اشارہ قصد ہی کی طرف ہے صدور کی طرف نہیں اسلئے یہ آیت صحابہ کرام کے مناقب کے ذیل میں آتی ہے کہ باوجود قصد کے ان سے اس کا ارتکاب نہیں ہوا۔

(۳) اللہ تعالیٰ اپنے لطف و کرم کا اظہار کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ۔ یعنی ان کو کار خیر میں تو ثواب مل جائے گا لیکن سزا اسی وقت ملے گی جب کوئی گناہ قصداً سرزد ہوا ہو۔ اتنا عظیم فرق صرف اس ایک ”ت“ کی زیادتی سے پیدا ہو گیا، حالانکہ دونوں کا مادہ ایک ہی ہے اس لئے کہ کسبت باب افتعال سے ہے جس میں قصد وارادہ ضروری ہے۔

(۴) حضرت زکریا کے بارے میں ارشاد ہوا۔

سَيِّدًا وَحَصُورًا وَنَبِيًّا مِنَ الصَّالِحِينَ۔ حصر کے لغوی معنی روکنے کے ہیں حصور اسی سے مشتق ہے لیکن یہ مبالغہ کا صیغہ ہے اس لئے اس کے اور حصر کے معنی میں بالکل مغایرت ہوگی۔ علامہ خفاجی فرماتے ہیں۔

”حضور مبالغہ کا صیغہ ہے اور مبالغہ صرف اختیاری افعال ہی میں پایا جاتا ہے لہذا حضور کے معنی ہیں ”قدرت کے باوجود محصور رہنا“ اس لئے معلوم ہوا کہ زکریا علیہ السلام مجبوراً محصور نہیں تھے بلکہ اُن کا یہ اپنا اختیاری فعل تھا۔

(۵) سورہ قدر میں ارشاد ہے:-

تَنَزَّلُ الْمَلَائِكَةُ وَالرُّوحُ۔

اس شب میں ملائکہ کا نزول ہوتا ہے۔ تنزل باب تفعّل سے ہے جس کی خاصیت تدریج ہے۔ یعنی کسی شے کا آہستہ آہستہ پورا ہونا۔ مصنف فتوحات الہیہ فرماتے ہیں:-

”آیت سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ تمام فرشتے اس شب میں دنیا میں آجاتے ہیں، ظاہر ہے کہ اس شب میں فرشتوں کے اترنے کے بارے میں کسی قسم کے شک کی گنجائش نہیں لیکن تنزل کا لفظ لاکر فرشتوں کے نزول کی نوعیت متعین کر دی کہ وہ یک بیک نہیں اترتے رہتے بلکہ جوق در جوق یکے بعد دیگرے اترتے رہتے ہیں جس طرح حجاج جوق در جوق خانہ کعبہ کی حاضری کیلئے آتے ہیں۔“

(۶) منافقین کے بارے میں خدا کہتا ہے۔ وَجَاءَ الْمُعَذِّرُونَ مِنَ الْأَعْدَابِ۔

یہاں معذرون نہیں فرمایا گیا کیونکہ ان دونوں میں بہت فرق ہے۔ مُعَذِّرٌ صرف اس شخص کے لئے استعمال کیا جاتا ہے جو معذور نہ ہو مگر خواہ مخواہ اپنے آپ کو معذور گردانے اور معذریہ اور غیر صحیح دونوں قسم کے عذروں کے لئے آتا ہے۔ قرآن نے

مَعْدَرُونَ کا لفظ استعمال کر کے یہ بتا دیا کہ منافقین حقیقتاً معذور نہیں تھے۔

(۷) وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ فِدْيَةٌ طَعَامُ مَسْكِينٍ۔ اس آیت کے تفسیری مباحث اہل علم کے سامنے ہیں لیکن یطیقونہ کے باب افعال سے آنے کے اسرار پر غور کیجئے تو بحث کس قدر آسان ہو جاتی ہے۔ باب افعال کی ایک خاصیت سلب ماخذ ہے اسلئے یطیقونہ کے معنی لَا يُطِيقُونَ ہوئے اب مفہوم میں کسی قسم کا اشکال نہیں رہا یعنی جو روزہ کی طاقت نہ رکھتے ہوں وہ اس کے بدلے فدیہ ادا کریں۔ لسان العرب کے مصنف فرماتے ہیں کہ طوق اور طاقت، مشقت یا تکلیف کے ساتھ طاقت رکھنے یا برداشت کرنے کو کہتے ہیں تو اب آیت کا مفہوم یہ ہو گا کہ جو لوگ روزہ رکھنے پر قادر تو ہیں لیکن اس میں انہیں مشقت اور تکلیف ہوتی ہے تو وہ اپنے روزے کے لئے فدیہ ادا کریں۔

اسی مفہوم کی تائید میں شرح ابو داؤد میں اس آیت کی تفسیر میں الحاق تہ کے معنی یہ لکھے ہوئے ہیں کہ وہ لوگ جو روزہ رکھنے پر مشقت و تکلیف کے ساتھ قادر ہوں ان کو اجازت ہے کہ وہ روزہ نہ رکھیں بلکہ اس کے بدلے میں فدیہ ادا کریں۔

(۹)

تصریحات بالا سے یہ بات واضح ہو گئی کہ قرآن شریف کی تفسیر کا اصلی طریقہ یہ ہے کہ آیات قرآنیہ کی توضیح قرآن ہی سے کی جائے۔ اس کے بعد احادیث صحیحہ کو پیش نظر رکھا جائے اور اگر زبان عرب کے قواعد کی پابندی اور اصول شریعت کی مطابقت کے ساتھ قرآن مجید کے معانی بیان کئے جائیں تو وہ بھی تفسیر کا صحیح طریقہ ہے اور اگر آیات قرآنیہ کے

مطلب کے بیان کرنے میں اصول شریعت اور قواعد زبان عرب کا لحاظ نہ کیا جائے تو یہ ناجائز ہے اور اسی کو ”تفسیر بالرأے“ کہتے ہیں۔

ترمذی شریف میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

”جو شخص قرآن میں اپنی رائے سے کہے تو چاہئے کہ وہ اپنا ٹھکانا دوزخ میں ڈھونڈ لے“

اور دوسری روایت میں ہے کہ

”جو شخص قرآن میں بغیر علم کے کچھ کہے تو چاہئے کہ وہ اپنا ٹھکانا دوزخ میں ڈھونڈ لے“

یہاں علم سے مراد قواعد عربیت اور اصول شریعت کا علم ہے بے شبہ جو شخص ان دونوں علوم سے ناواقف ہے اس کو قرآن شریف کی تفسیر کرنا حرام ہے۔ علامہ شاطبی نے موافقاً میں صیح فرمایا کہ

”رائے کی دو قسمیں ہیں ایک وہ رائے جو کتاب سنت کے مطابق اور قواعد زبان عرب کے موافق ہو۔ اس رائے سے اعراض و غفلت ممکن نہیں ہے“

دوسری رائے وہ جو نہ دلائل شرعیہ کے موافق ہے اور نہ زبان عرب کے قواعد کے مطابق ہو تو بے شبہ یہی رائے قابل مذمت ہے“

(ج-۳)

جصاص رازی نے احکام القرآن میں فرمایا کہ ”حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد۔

من قال في القرآن برأية فإصاب
جو شخص قرآن میں اپنی رائے سے کچھ کہے وہ اگر
صیح بھی کہے تو غلط ہے۔
فقد اخطأ۔

اس شخص کے متعلق ہے جو قرآن کی تفسیر میں اصول سے ہٹ کر وہ بات کہے جو اس کے خیال میں آجائے اور اگر کوئی شخص (آیات قرنیہ کا) مطلب بیان کرے اور اس کو ایسے معانی پر محمول کرے، جن پر سب کا اتفاق ہے تو وہ شخص قابل تعریف ہے، اجر کا مستحق ہے اور ان لوگوں میں سے ہے جن کے متعلق خدا نے ارشاد فرمایا :-

لَعَلَّہُمُ الَّذِیْنَ یَسْتَنْبِطُوْنَہٗ مِنْہُمْ۔ (ج ۲ ص ۸۸)

(۱۰)

قرآن مجید کے طالب علم کے لئے ضروری ہے کہ اس کو قرآن مجید میں جن قوموں کا ذکر آیا ہے اور جن مذاہب سے خطاب فرمایا گیا ہے اُن سے نیز عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی تاریخ سے گہری واقفیت ہو۔ یہ مطالعہ جتنا گہرا ہوگا اسی قدر آیات قرآنیہ کا صحیح انکشاف ہوگا۔

صورت یہ ہے کہ قرآن مجید نے اپنے زمانہ نزول کے چار گمراہ فرقوں، مشرکین، یہود، نصاریٰ اور منافقین کو خصوصی طور سے مخاطب کیا ہے اُن کے عقائد پر تنقید کی ہے اور اعمال و اخلاق کی پردہ دہری کی ہے، اب جس شخص کو ان فرقوں کے عقائد کی تفہیم نہیں ہے یا جس کی نگاہوں میں ان کی اخلاقی اور سیاسی زندگی نہیں ہے وہ متعلقہ آیات میں اسلوب بیان اور طرز خطاب کی اہمیت اور استدلال کی قوت کا صحیح اندازہ نہیں کر سکتا ہے۔

اسی طرح قرآن مجید نے مسلمانوں کو خطاب کیا ہے۔ عقائد، عبادات، اخلاق اور معاملات میں اُن کی رہنمائی کی ہے۔ غزوات اور اس وقت کے اہم واقعات کا ذکر فرمایا ہے۔ اب اگر زمانہ نزول قرآن کی تاریخ سے کوئی شخص ناواقف ہے تو وہ آیات کو ان کے صحیح

محل پر نہیں رکھ سکتا ہے بلکہ اندیشہ ہے کہ کسی موقع پر غلطی کا ارتکاب نہ ہو جائے۔

اسی لئے امام شاطبی نے موافقات (ج ۳) میں فرمایا کہ

”جو شخص قرآن مجید کو سمجھنا چاہے اس کیلئے نزول کی معرفت ضروری ہے“

اس اصول کی تشریح کرتے ہوئے امام شاطبی نے بڑی لطیف بات کہی کہ فن معانی و بیان کی بنیاد اس پر ہے کہ نفس خطاب مخاطب کرنے والے اور جس کو مخاطب کیا گیا ہے، اس کے متعلق صحیح معلومات ہوں، اسی کو مقتضائے حال کہتے ہیں۔ اسباب نزول کی واقفیت کا مطلب اسی مقتضائے حال کا جاننا ہے، شاطبی نے کہا بسا اوقات اس مقتضائے حال سے ناواقفیت سخت اشکالات کا باعث بنتی ہے۔

حاصل یہ ہے کہ نزول قرآن کے زمانے میں مسلمانوں کے حالات اور قرآن کے مخاطب فرقوں کے عقائد رسوم اور عادات سے واقفیت از بس ضروری ہے۔ امام شاطبی نے فرمایا کہ :-

” (طالب قرآن کو) عادات عرب سے ناواقفیت بعض اوقات ایسی

مشکلات میں ڈال دیتی ہے کہ اس سے نجات کی شکل اس کے سوا کچھ اور

نہیں ہوتی کہ اس ناواقفیت کو دور کیا جائے۔“

(۱۱)

دوسرے مذاہب کے ماننے والوں نے بھی قرآن کا مطالعہ کیا ہے مگر ظاہر ہے کہ بالعموم ان کا نقطہ نظر اعتراض، یا قرآنی آیات اور قرآنی الفاظ کو اپنے کسی مطلب کے لئے استعمال کرنا اور مسلمانوں کو فریب دینا ہوتا ہے اس لئے قرآن مجید کے طالب علم کو اس باب میں بہت ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے، وضاحت کی غرض سے ہم اس

مسئلہ کی صرف ایک مثال پیش کرتے ہیں۔

قرآن پاک میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ”اللہ کا کلمہ“ کہا گیا ہے ارشاد فرمایا:
 وَكَلَّمْنَاهُ الْقَاهَا إِلَىٰ مَرْيَمَ (نساء) اور اللہ کا کلمہ ہیں جس کو اللہ نے مریم تک پہنچایا۔
 عیسائیوں نے مسلمانوں کو اس لفظ سے ہمیشہ کسی نہ کسی فریب میں مبتلا کرنا چاہا
 ہے۔ عباسی عہد کے فتنہ خلق قرآن میں بھی اسی لفظ کا تماشا نظر آتا ہے جس کی حقیقت
 یہ ہے کہ اہل سنت والجماعت کا عقیدہ ہے کہ کلام اللہ غیر مخلوق ہے نصاریٰ اس پر
 اعتراض کرتے تھے کہ جب کلام اللہ غیر مخلوق ہے تو ”یسح“ جو کلمہ اللہ ہیں وہ بھی غیر
 مخلوق ہیں۔

معلوم ہوتا ہے کہ معتزلہ کو کلام اللہ کے مخلوق ہونے پر جو اس قدر اصرار تھا
 وہ عیسائیوں کے اسی اعتراض سے بچنے کی بنا پر تھا۔

دلیچپ بات یہ ہے کہ نصاریٰ کلمہ اللہ کے لفظ سے حضرت مسیح علیہ السلام کے
 غیر مخلوق ہونے پر استدلال کرتے تھے اور جہمیدہ لفظ سے قرآن کے مخلوق ہونے کو
 ثابت کرتے تھے ان کا استدلال یہ تھا کہ قرآن نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو کلمہ اللہ کہا
 ہے اور حضرت عیسیٰ مخلوق ہیں نتیجہ یہ نکلا کہ کلام اللہ بھی مخلوق ہے۔

امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے نصاریٰ اور جہمیدہ دونوں کے اقوال کو رد کیا ہے
 وہ فرماتے ہیں کہ ”حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف جن امور کا انتساب کیا جاتا ہے ان کا انتساب
 قرآن کی طرف ممکن نہیں ہے۔ حضرت عیسیٰ بچہ تھے جو ان ہوئے کھاتے پیتے تھے۔ امر وہی
 کے مخاطب تھے۔ حضرت نوح اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں سے تھے۔ پھر کیا

لہ الجواب المصحح ابن تیمیہ ج اول صفحہ ۳۰۰ مہر۔ لہ کتاب الرد علی الجہمیدہ امام احمد بن حنبل۔

قرآن مجید کے متعلق ان امور کی نسبت ممکن ہے؟

مطلب یہ ہو کہ قرآن پاک اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ایک دوسرے پر قیاس
 کرنا درست نہیں ہے۔ باقی رہا قرآن مجید کا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ”کلمہ اللہ“ کہنا تو اس
 کا مطلب یہ ہے کہ وہ اللہ کے ”کلمہ کن“ سے پیدا ہوئے نہ یہ کہ وہ خود کلمہ تھے۔

اصل فقہ یہ ہے کہ عیسائیوں نے جب اپنے صحیح دین کو کھو دیا اور دوسرے مذاہب
 نیز اہل فلسفہ کو اپنی طرف مائل کرنا چاہا تو عیسوی مسائل میں ایسی لچک پیدا کرنا شروع
 کر دی کہ ہر مذہب و مسلک کے لوگ ان کے دین میں گنجائش پاسکیں چنانچہ انہوں
 نے دیکھا کہ فلاسفہ معقل، عاقل اور معقول کے اتحاد کے قائل ہیں تو انہوں نے بھی باپ
 بیٹے اور روح القدس کا نقشہ اپنے یہاں کھینچ لیا۔

خالص یونانی فلسفہ لوگس (LOGOS) کے نام سے ایک اولین ہستی کو تسلیم کیا
 ہے جس کو اللہ نے تمام کائنات کی پیدائش کا ذریعہ بنایا ہے اسی کو فلاسفہ، عقل
 اول سے تعبیر کرتے ہیں۔

عیسائیوں نے لوگس کے اسی تخیل کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر چسپاں کر کے بت
 پرست یونانی فلسفیوں کو دین عیسوی میں شامل کرنے کی کوشش کی لیکن اس اندھی
 تقلید میں وہ خود گمراہ ہو گئے۔

عیسائیوں نے فلاسفہ کی طرح جب مسلمانوں کو اپنے دام میں لانا چاہا تو لوگس کے اسی
 تخیل کو قرآنی لفظ کلمہ اللہ کے ذریعہ سے ادا کرنا چاہا۔

ظاہر ہے کہ قرآن نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا کلمہ جو کہا ہے اس کو عیسائی

عقیدے سے کوئی تعلق نہیں ہے بلکہ خود اصل دین عیسوی بھی اس سے بری ہے ،
عیسائیوں نے کلمۃ اللہ کے تحت میں جتنے عقیدے پیدا کئے ہیں وہ سب کے سب مقرر
اور یونان کے بت پرست فلاسفہ سے ماخوذ اور توحید کے خلاف ہیں۔

قرآن میں کلمۃ اللہ کا مفہوم | اب دیکھنا چاہیے کہ قرآن پاک نے ”کلمہ“ کو
کس معنی میں استعمال کیا ہے ؟

قرآن پاک نے کلمہ کا اطلاق ایک ”قول تام“ پر کیا ہے۔ یہ قول تام کہیں صرف
بات کے معنی میں ہے۔ ارشاد ہوا۔

(۱) وَيُنذِرَ الَّذِينَ قَالُوا اتَّخَذَ
اللَّهُ وَلَدًا مَّا لَهُمْ بِهِ مِنْ عِلْمٍ
وَلَا يَبَاطِئُهُمْ كِبَرُ كَلِمَةٍ تَخْرُجُ
مِنْ أَفْوَاهِهِمْ۔ (کہف ۱)

اور تاکہ ان لوگوں کو ڈرائے جو یوں کہتے ہیں
کہ (نعوذ باللہ) اللہ تعالیٰ اولاد رکھتا ہے تو
اس کی کوئی دلیل ان کے پاس نہیں ہے۔
بڑی بھاری بات ہے جو ان کے منہ سے نکلتی ہے۔

اس آیت میں قرآن نے قول اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا کو کلمہ کہلایا ہے۔

(۲) قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا
إِلَى كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ
أَنْ لَا نَعْبُدَ إِلَّا اللَّهَ وَلَا نُشْرِكَ
بِهِ شَيْئًا وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا
أَرْبَابًا مِنْ دُونِ اللَّهِ ط (آل عمران)

آپ فرمادیجئے کہ اہل کتاب آؤ۔ ایک ایسی بات
کی طرف جو کہ ہمارے اور تمہارے درمیان
(مسلم ہونے میں) برابر ہے کہ بجز اللہ تعالیٰ کے
اور کسی کی عبادت نہ کریں اور اللہ تعالیٰ کی ساقت
کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں اور ہم میں سے
کوئی کسی دوسرے کو رب نہ قرار دے اللہ کو چھوڑ کر۔

اس آیت میں یہ پوری بات (أَنْ لَا نَعْبُدَ إِلَّا اللَّهَ ط) کلمہ ہے۔

(۳) حَتَّىٰ إِذَا أَجَاءَ أَحَدَهُمُ
الْمَوْتُ قَالَ رَبِّ ارْجِعُونِ لَعَلِّي
أَعْمَلُ صَالِحًا فِيمَا تَرَكْتُ كَلَّا إِنَّهَا
كَلِمَةٌ هُوَ قَائِلُهَا ط (مؤمنون ۶)

یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی پر موت
آتی ہے اس وقت کہتا ہے کہ ”اے میرے رب
مجھ کو پھر واپس بھیج دیجئے تاکہ جس کو میں چھوڑ
رہا ہوں، اس میں نیک کام کروں“ ”ہرگز نہیں“
بیشک وہ ایک بات ہی ہے جس کو وہ کہے

جار رہا ہے۔

یہاں قول رَبِّ ارْجِعُونِ لَعَلِّي أَعْمَلُ صَالِحًا فِيمَا تَرَكْتُ
کلمہ ہے۔

لفظ کلمہ کے دوسرے معنی ”طے شدہ بات“ امر مقرر کے ہیں یعنی وہ بات
جو علم الہی میں پہلے طے ہو چکی ہے۔ آیات ذیل اس کی شاہد ہیں۔

وَلَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا
الْمُرْسَلِينَ ط إِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنصُورُونَ
وَرَاتِ جُنُودَنَا لَهُمُ الْغَالِبُونَ۔ (صافات ۵)

اور ہمارے خاص بندوں یعنی پیغمبروں کے لئے
ہماری بات پہلے ہی سے مقرر ہو چکی ہے کہ
بیشک وہی غالب کئے جائیں گے اور ہمارا
ہی لشکر غالب رہتا ہے۔

معلوم ہوا کہ یہ بات کہ پیغمبروں کو کامیابی اور خداوندی لشکر کو غلبہ ہوگا۔ پیشتر
ہی اس کا فیصلہ ہو چکا ہے۔ اسی کو سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا سے ادا فرمایا۔

كَذَٰلِكَ حَقَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ عَلَى الَّذِينَ
كَفَرُوا إِنَّهُمْ أَصْحَابُ النَّارِ۔

اسی طرح تمام کافروں پر آپ کے رب کی یہ بات
ظہرت ہو چکی ہے کہ وہ لوگ ”دوزخی ہوں گے۔“
(مومن)

یعنی کافروں کا دوزخی ہونا اللہ کے نزدیک ایک امر ثابت ہے اس کے لئے
حَقَّتْ کَلِمَةُ رَبِّكَ ارشاد فرمایا گیا ہے۔

وَأَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِينَ كَانُوا
يَسْتَضَعُونَ مَشَارِقَ الْأَرْضِ وَ
مَغَارِبَهَا الَّتِي بَارَكْنَا فِيهَا وَتَمَّتْ
كَلِمَةُ رَبِّكَ الْحُسْنَىٰ عَلَىٰ بَنِي
إِسْرَائِيلَ۔ (اعراف ۱۶)

اور ہم نے اُن لوگوں کو جو بالکل کمزور شمار کئے
جالتے تھے۔ اس سرزمین کے پورب اور پچیم
کا مالک بنا دیا جس میں ہم نے برکت رکھی
ہے اور آپ کے رب کی بھلی بات بنی اسرائیل
کے حق میں ان کے صبر کی وجہ سے پوری ہو گئی۔

گویا بنی اسرائیل کا صبر کے باعث مصریوں کے مقابلہ میں کامیاب ہونا اور زمین کا وارث
بنا اللہ کے نزدیک ایک ہونے والی بات تھی جو ہو کر رہی اسی کو کَلِمَةُ رَبِّكَ
الحُسْنَىٰ سے ظاہر فرمایا۔

اہل فسق اپنے تہمرد اور سرکشی کی وجہ سے ایمان نہ لائیں گے یہ بات اللہ کے نزدیک
مسلم ہے اسی کو حَقَّتْ کَلِمَةُ رَبِّكَ سے یوں ادا کیا۔

كَذَٰلِكَ حَقَّتْ کَلِمَةُ رَبِّكَ عَلَىٰ
الَّذِينَ فَسَقُوا أَنَّهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ۔
(یونس ۴)

اسی طرح آپ کے رب کی یہ (ازلی، بات کلامیہ
نہ لائیں گے تمام سرکش لوگوں کے حق میں
ثابت ہو چکی ہے۔

ان تمام تشریحات کے بعد قرآن پاک کا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو کَلِمَةُ اللَّهِ کہنے
کا مقصد واضح ہو جاتا ہے یعنی بغیر آپ کے پیدا ہونا علم الہی میں ایک طے شدہ بات تھی۔
اسی طے شدہ بات کو قرآن پاک نے (امر مقضیٰ) کہہ کر بالکل صاف کر دیا ہے فرمایا۔
قَالَتْ أَنَّىٰ يَكُونُ لِي غُلَامٌ وَلَمْ
حضرت مریم کہنے لگیں بھلا میرے بطن کا کس

يَمْسَسُنِي بَشَرٌ وَلَمْ أَكُ بَغِيًّا
قَالَ كَذَٰلِكَ قَالَ رَبُّكَ هُوَ
عَلَىٰ هَيْئَةٍ وَلِنَجْعَلَهُ آيَةً لِلنَّاسِ
وَرَحْمَةً مِنَّا وَكَانَ أَمْرًا مَّقْضِيًّا۔

طرح ہو گا حالانکہ مجھ کو کسی بشر نے ہاتھ نہیں
لگایا اور نہ میں بدکار ہوں فرشتے نے کہا
یوں ہی ہو جائے گا تمہارے رب نے فرمایا
ہے کہ یہ بات مجھ کو آسان ہے اور (اس طور

(مریم ۲)

پر اس لئے پیدا کریں گے) تاکہ اس فرزند
کو ہم لوگوں کے لئے ایک نشانی اور رحمت کا
سبب بنائیں اور یہ ایک طے شدہ بات ہے۔

اس سے صاف ظاہر ہوا کہ قرآن کی اصطلاح میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کَلِمَةُ اللَّهِ
اس لئے ہوئے کہ ان کا اس طرح پیدا ہونا ایک امر مقدر اور طے شدہ بات تھی۔

کَلِمَةُ اللَّهِ اور بَابِئِيل | بَابِئِيل کے عربی تراجم میں بھی ایسی آیات موجود ہیں جن میں
کلمہ کا وہی مفہوم ہے جو قرآن کا مفہوم ہے یعنی کلمہ بہ معنی

بات، حکم اور امر مقدر۔

چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

(۱) امور الثالث والعشرون آیت ۶

بِكَلِمَةِ الرَّبِّ صَنَعَتِ السَّمَوَاتِ۔ اللہ کے کلمے سے آسمان بنے۔

(۲) اخبار الايام الاول باب ۱۷ آیت ۳

حلت كلمة الله على تاتان النبی۔ اللہ کا کلمہ تاتان نبی کے پاس پہنچا۔

(۳) کتاب ہوسیع باب اول۔

كلمة الرب التي صارت الى هوسيع۔ اللہ کا کلمہ جو ہوسیع کے پاس پہنچا۔

حلت کلمۃ الرب اللہ کہ یوحنا بن زکریا۔

علی یوحنا بن زکریا کے پاس پہنچا۔

کلمۃ اللہ اور کلمۃ تکوین | اس سلسلے میں یہ امر بھی ذہن نشین کر لینے کے قابل ہے کہ مفسرین عموماً کہتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام

کی پیدائش کلمۃ تکوین یعنی کن (ہو جا) سے ہوئی جس طرح سارے عالم کی تکوین اسی کن (ہو جا) کے حکم سے ہوتی ہے۔ اِذَا اقْضٰی اَمْرًا فَاَتَمَّ اَقْوَلُ لَدٰ کُنْ فَمَیْکُوْن۔ (مریم) جس کام کو پورا کرنا چاہتا ہے تو کہتا ہے کہ ہو جا پس وہ ہو جاتا ہے۔

اسلئے حضرت عیسیٰ کلمۃ اللہ کہے گئے۔

اس سے معلوم ہوا کہ کلمۃ اللہ وہی امر مقدر ہے اور کلمۃ تکوین اس امر مقدر میں تصرف کیلئے تعبیر ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے بھی کلمۃ تکوین کو عالم میں تصرف ارادی سے تعبیر کیا ہے۔

اس بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ قرآن پاک نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا کلمہ اس لئے نہیں کہا ہے کہ وہ اللہ کی صفت کلام ہیں جو ذات الہی کے ساتھ قائم ہے، یا ذات الہی میں ہیں یا ذات الہی ہیں جیسا کہ عیسائیوں کا بیان ہے بلکہ اس لئے کہا ہے کہ جس طرح وہ حضرت مریمؑ کے پیٹ سے مستثنیٰ شکل میں پیدا ہوئے۔ یہ پیدائش اللہ تعالیٰ کا امر مقدر تھا، جس کا ظہور حکم الہی سے ہوا۔

لہ الغور الکبیر بحث شرک ۱۲۔

سوال یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کو اللہ تعالیٰ نے خاص طور سے اپنا امر مقدر یا طے شدہ یا حکم الہی ان کی پیدائش کیوں بنایا اور ان کی روح کو اپنی طرف کیوں منسوب کیا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ وہ حضرت مریمؑ اور حضرت عیسیٰ علیہا السلام پر جو الزام لگاتے تھے کہ حضرت مریمؑ (نعوذ باللہ منہ) مرتکب حرام ہوئی تھیں اور حضرت عیسیٰ (نعوذ باللہ منہ) لدا لڑا تھا۔ اس الزام کو دور فرما کر دونوں کی پاکی اور طہارت کے اظہار کیلئے اللہ تعالیٰ نے انکو پیدائش کے طریق کو اپنا حکم تقدیری اور اپنی جانب سے بخشی ہوئی روح زندگی فرمایا اور حضرت مریمؑ کی نسبت ارشاد فرمایا۔ وَ مَرْیَمَ بَنَتَ عِمْرَانَ الَّتِیْ أَحْصٰتْ اور مریم بنت عمران جس نے اپنی شرمگاہ کی قَرْحَهَا فَفَفَخْنَا فِیْهِ مِنْ رُّوْحِنَا محافظت کی، پس پھونکا ہم نے اس میں اپنی وَ صَدَّقَتْ بِکَلِمَاتِ رَبِّهَا وَ روح سے اور مانتی تھی اپنے رب کی باتوں کو کُتِبَہِ وَ کَانَتْ مِنَ الْقَائِمٰتِ۔ اس کی کتابوں کو اور تھی وہ فرمانبرداروں (تحریم - ۲) میں سے۔

(۱۲)

”مستشرقین یورپ“ جن کے فضل و کمال کا سکتہ دلوں پر بیٹھا ہوا اور جن کی تلاش و تحقیق کا رعب دماغوں پر چھایا ہوا ہے۔ وہ اسلام کی عداوت میں کبھی ایسی عایمانہ اور جاہلانہ روش اختیار کرتے ہیں جس پر سطحی معلومات والا انسان بھی ہنسے بغیر نہیں رہ سکتا۔ چنانچہ مشہور جرمن محقق و مستشرق نولڈ کی جس کے علمی افلاس کا یہ عالم ہے کہ وہ قرآن پاک کو (نعوذ باللہ) تصنیف محمدؐ بتلاتا ہے۔ انسائیکلو پیڈیا آف برٹانیکا میں قرآن مجید پر ریویو کرتے ہوئے حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق لکھا ہے کہ

لہ جلد ۱۵ ص ۹۰۰ طبع یازدہم کیمبرج یونیورسٹی۔

”عرب سے تو انہیں واقفیت تھی لیکن بیرون عرب کا جہاں ذکر کرتے ہیں وہاں ان کی بے خبری (لفظ کا اصلی ترجمہ جہالت ہے) کی پردہ دری ہو جاتی ہے چنانچہ مصر کی زرخیزی کو جہاں کہ بارش تقریباً نہیں دیکھی جاتی ہے وہ دریائے نیل کے سیلاب کے بجائے بارش پر منحصر رکھتے ہیں۔“

واقعہ کی اصل صورت یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام جب قید خانے میں تھے تو مصر کے بادشاہ نے خواب دیکھا کہ سات موٹی گائیں ہیں اور سات ڈبلی گائیں موٹی کو نکل گئیں اور سات شاداب بالیں ہیں اور سات خشک، خشک بالوں نے سبز کو کھا لیا۔ شاہ مصر کے خواب کی حضرت یوسف علیہ السلام نے تعبیر دی جس کو قرآن پاک نے ان الفاظ سے بیان فرمایا ہے :-

قَالَ تَزْرَعُونَ سَبْعَ سِنِينَ دَأْبًا فَمَا حَصَدْتُمْ فَذَرُّوْهُ فِي سُنُبِهِ إِلَّا قَلِيلًا مِّمَّا تَأْكُلُونَ ثُمَّ يَأْتِي مِنْ بَعْدِ ذَلِكَ سَبْعٌ شِدَادٌ يَأْكُلْنَ مَا قَدَّ مِنْهُنَّ لَهُنَّ إِلَّا قَلِيلًا مِّمَّا تَحْسُنُونَ ثُمَّ يَأْتِي مِنْ بَعْدِ ذَلِكَ عَامٌ فِيهِ يُغَاثُ النَّاسُ وَفِيهِ يَعْصَرُونَ (یوسف - ۶)

بارش ہوگی ویا فریادری ہوگی اور اس میں شیرہ بھی نہ پھوٹیں گے۔

اس تعبیر میں ایک لفظ (یغاث) ہے عموماً جس کا مفہوم یہ لیا گیا ہے کہ بارش ہوگی۔ جرمن ”مشرق“ کے نزدیک مصر کے سلسلہ میں بارش کا ذکر نعوذ باللہ صاحب قرآن کی بے خبری کی دلیل ہے۔

بسوخت عقل ز حیرت کہ ایں چہ بوا بھمی است

بے خبر انسان کو خدائے عظیم و خمیر کے کلام پر تنقید کی جرأت؟ ذیل کی سطروں میں اسی تنقید کی اصل حقیقت آشکارا کی گئی ہے۔

(۱) اس سلسلہ میں پہلی بات یہ ہے کہ ”یغاث“ کے معنی صرف پانی برسنے کے نہیں ہیں۔ مفسرین کی ایک جماعت کہتی ہے کہ غیث (بمعنی بارش) سے مشتق نہیں ہے بلکہ اس کا مادہ غوث ہے جس کے معنی ”فریادری“ کے ہیں یعنی اس فقط کے بعد ایسا سال آئے گا جس میں لوگوں کی فریادری ہوگی اور فقط دور ہوگا۔ اس قحط کے خاتمہ کا سبب بارش ہوگی۔ یانیل کا سیلاب؟ اس کا یہاں کوئی تذکرہ نہیں ہے۔

روح المعانی میں ہے۔

ای یصیبهم غیث ای مطر کما قال ابن عباس یعنی اُن کو پانی پہنچے گا جیسا کہ ابن عباس ابن عباس و مجاہد و الجہور فہو مجاہد اور جہور نے کہا ہے اس وقت من غاث الثلاثی الیای و قیل هو اس کا مادہ غیث ہوگا اور کہا گیا من الغوث ای الفرج بقال اُغاثنا ہے کہ اس کا مادہ غوث ہے یعنی فریادری اللہ تعالیٰ اذ امدنا یرقم المکارہ اور مصیبت کا دور کرنا کہہا جائے اُغاثنا اللہ حین اظلتنا فہو رباعی جب کہ اللہ ہماری مصیبتوں کو دور کرے۔

واوی۔

قاضی بیضاوی کہتے ہیں۔

یمطرون فیہ من الغیث او بارش ہوگی جب کہ مادہ غیث ہو اور اگر مادہ
یغاثون من القحط من الغوث۔ غوث ہو تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ قحطان
سے دور کیا جائے گا ان کی فریاد سی ہوگی۔

ثعالی کی جواہر الحسان فی تفسیر القرآن میں ہے۔

جائز ان یكون من الغیث وهو جائز ہے کہ غیث سے ہو جیسا کہ ابن عباس
قول ابن عباس وجہور المفسرین۔ اور جہور مفسرین کا قول ہے۔

ای یمطرون وجائز ان یكون من یعنی بارش ہوگی اور جائز ہے کہ غوث سے ہو
اغاثهم الله اذا فرج عنهم ومنه جس کے معنی فریاد رسی کے ہیں یعنی ان
الغوث وهو الفرج۔ کی شکل دہ کی جائے گی۔

(۲) اور اگر عام مفسرین کے مسلک کے مطابق بارش ہی کے معنی لئے جائیں تو بھی
فاضل مشرق کا یہ دعویٰ کہ مصر میں بارش بالکل نہیں ہوتی ہے، غلط ہے۔ بارش
کم ہی لیکن اس کا مطلقاً انکار خلاف واقعہ ہے۔

یعقوبی کتاب البلدان میں کہتا ہے کہ مصر میں سواحل پر کس قدر بارش ہوتی ہے۔

الحضارة المصرویہ میں ہے کہ یہ کہنا ہرگز صحیح نہیں ہے کہ وادی نیل بارش سے محروم

ہے۔ ای مارسڈن وئی آسفر ڈاسمٹھ کے جغرافیہ عالم میں ہے۔

لے بیضاوی ج ۱ اول ۳۹۹ لے جواہر الحسان ج ۲ ص ۲۴۱ لے کتاب البلدان ص ۳۴۰ لے الحضارة

المصریہ ص ۸ لے جغرافیہ عالم ج ۲ ص ۱۶۳ حیدر آباد۔ تقویم البلدان ص ۱۱۸۔

”بارش یہاں بہت ہی کم یعنی قاہرہ میں ایک انچ سالانہ اور اسکندریہ جو مندر سے
متصل واقع ہے ۱۸ انچ سالانہ سے زیادہ نہیں ہوتی۔“

(۳) مصر کے وہ مقامات جہاں فراعنہ مصر کا قیام تھا ان کا بارانی ہونا تو بہر حال
ثابت ہے چنانچہ مصر کے سواحل اور قاہرہ جو ساحل دریائے نیل پر چودہ میل مربع رقبہ
میں آباد ہے وہاں بارش کا ہونا معلوم ہو چکا ہے، تاہم انچ سے معلوم ہوتا ہے کہ فراعنہ مصر
کا قیام قاہرہ سے قریب ہی منف اور عین شمس میں رہا کرتا تھا۔

ابو الفداء کی تقویم البلدان میں ہے کہ عین شمس کو مدینہ فرعون کہا جاتا ہے اور
یہ قاہرہ سے نصف مرحلہ پر واقع ہے۔

یا قوت نے بحم البلدان میں منف کو فرعون کا شہر بتلایا ہے اور یہاں کے آثار قدیمہ
کے سلسلے میں لکھا ہے کہ یہیں حضرت یوسف علیہ السلام کا مکان تھا۔ یہیں فرعون کا
قیام بھی رہا کرتا تھا اور یہیں فرعون کا عین شمس تھا اور اس وقت فسطاط کا جو محل وقوع
ہے وہ عین شمس اور منف کے درمیان ہے۔

اصل یہ ہے کہ عین شمس ایک پیکل تھا لوگ اس کی زیارت کو آتے تھے پھر یہاں
آبادی قائم ہو گئی اور رفتہ رفتہ اس آبادی نے شہر کی حیثیت اختیار کر لی ورنہ یہ منف
سے الگ نہیں ہے۔

خط مقریزی میں ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے حضرت یعقوب علیہ السلام
اور پورے خاندان کو جس میں ۷۳ مرد اور عورتیں شامل تھیں فرما اور عین شمس کے درمیان
ٹھہرایا تھا اور یہاں کی زمین بہت خداداد ہے

لے تقویم البلدان ص ۱۱۸ لے بحم البلدان ج ۲ ص ۱۸۱ لے مقریزی ج ۱ ص ۳۱۸ لے مقریزی ج ۱ ص ۳۹۷۔

اب بھی عین شمس قاہرہ کے مضافات میں موجود ہے مسلمان اس کو عون اور یوپی لوگ حبیلوپوس کے نام سے یاد کرتے ہیں اب یہاں بڑے بڑے مکانات اور شاندار ہوٹل ہیں، قاضی ولی محمد صاحب اپنے سفرنامہ مصر ۱۹۲۲ء میں لکھتے ہیں۔

”کہتے ہیں کہ اس جگہ کو حضرت موسیٰ کی اقامت کا شرف حاصل ہوا تھا اور فرعون کا محل بھی یہیں کہیں تھا اور یہیں عزیز مصر کے بنگلہ میں زینحارہتی تھی اس جگہ کوئی سیکل شمی تھا جہاں انقلاب پرستی ہوتی تھی۔“

ان تفصیلات سے معلوم یہ ہوا کہ فرعونہ مصر قاہرہ کے قریب ہی آباد تھے اور وہاں بارش ہوتی تھی اسلئے حضرت یوسف علیہ السلام کی تعبیر خواب میں اگر بارش کا ذکر کیا جائے تو یہ کوئی خلاف واقعہ بات نہیں ہے۔

(۴) محقق مستشرق نے مصر کی زرخیزی کو دریائے نیل پر منحصر رکھا ہے۔ لیکن اس پر غور نہیں کیا کہ خود دریائے نیل کا پانی بھی بارش ہی کے پانی کا نتیجہ ہے۔

یعقوبی کا بیان ہے کہ مصر کے اور اس کے دیہاتوں کا کام نیل سے چلتا ہے اور نیل کے پانی میں بارش کے اس پانی سے زیادتی ہوتی ہے جو گرمی میں برستا ہے۔

الحضارة المصرية میں ہے۔

اب یہ بات بالکل واضح ہو چکی ہے کہ نیل کا فیضان اس بارش کا نتیجہ ہے جو بارش ماہ میں وسط افریقہ میں ہوتی ہے جہاں کہ دریائے نیل کا منبع ہے اور وہاں سے مصر کی طرف یہ پانی سرسبزی اور شادابی لے کر آتا ہے۔

عہد حاضر کے مشہور عالم علامہ سید رشید رضا مرحوم جن کی پوری زندگی تقویٰ بامصر ہی میں گزری وہ اپنی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ مصر کو بارش کے پانی سے مستثنیٰ نہیں کیا جاسکتا۔ کہا جاتا ہے کہ مصر کی زندگی بارش سے نہیں بلکہ نیل کے پانی سے ہے حالانکہ خود نیل کا پانی بارش ہی کا ممنون ہے۔ نیل کا فیضان اور اس کی کمی درحقیقت ان مقامات کی بارش پر منحصر ہے جہاں سے نیل میں پانی آتا ہے اس ضمن میں علامہ مرحوم نے قرآن پاک کی آیت نقل فرمائی ہے۔

أَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَسَلَكَ سُبُلًا بِهَا يَنْبُجُ فِي الْأَرْضِ (زمر ۲)

اللہ تعالیٰ نے آسمان سے پانی برسایا پھر اس کو زمین کے سوتوں میں داخل کر دیتا ہے۔

اس کے بعد فرمایا کہ وہ چھوٹے دریا جو نیل کے ”ینابیح“ ہیں وہ بارش ہی کے پانی سے ہیں یہاں فرعون کا وہ مقولہ بھی پیش نظر رکھنا چاہئے جس کو قرآن پاک نے نقل کیا ہے۔

أَلَيْسَ لِي مُلْكٌ مِّثْلُ مَقْصُودِهِ ۖ وَالْأَنْهَارُ لِي مِيرَاقٍ ۚ أَلَمْ يَجْعَلْ لِي سُبُلًا ۚ أَلَمْ يَجْعَلْ لِي سُبُلًا ۚ أَلَمْ يَجْعَلْ لِي سُبُلًا ۚ

اے میری قوم! کیا مصر کی سلطنت میری نہیں ہے اور یہ نہریں میری پائیں میں بہہ رہی ہیں۔

اس سلسلہ میں قرآن پاک کی دوسری آیت بھی قابل توجہ ہے۔

قرآن مجید میں اللہ تبارک و تعالیٰ نے اپنی نشانوں میں سے ایک نشانی بھی بتائی ہے کہ ہم ان مقامات پر پانی پہنچاتے ہیں جہاں بارش نہیں ہوتی یا اگر ہوتی ہے تو اس قدر کم کہ اس سے پورا نفع نہیں اٹھایا جاسکتا ہے۔ فرمایا:۔

أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّا نَسُوقُ الْمَاءَ إِلَىٰ

کیا انہوں نے اس بات پر نظر نہیں کیا کہ ہم

الْأَرْضِ الْجُرْزُ فَتُخْرِجُ بِهِ زَرْعًا خشک افتادہ زمین کی طرف پانی پہنچاتے
تَأْكُلُ مِنْهُ الْعَامُ هُمْ وَأَنْفُسُهُمْ ہیں۔ پھر اس کے ذریعے کھیتی پیدا کرتے
أَفَلَا يَصْصِرُونَ - (سجده ۳) ہیں جس سے اُن کے مواشی اور وہ خود
بھی کھاتے ہیں تو کیا وہ دیکھتے نہیں ہیں؟۔

مفسر ابن جریر نے حضرت عبداللہ بن عباس سے ”ارض جرز“ کے یہ معنی نقل کئے ہیں۔

قَالَ الْجُرْزُ الَّتِي لَا يُمْطَرُ إِلَّا بِمَطَرٍ جزر وہ ہے جہاں ناکافی بارش ہوتی ہو۔
لَا يَغْنَى عَنْهَا شَيْئًا إِلَّا مَا سوا اس کے جو پانی سیلاب سے پہنچ
يَأْتِيهَا مِنَ السَّيُولِ۔ جلے۔

حافظ سیوطی حن الحافزہ میں کہتے ہیں۔

”ایک جماعت کے نزدیک ارض جرز سے مراد مہر کی سرزمین ہے۔“
حافظ ابن کثیر اپنی تفسیر میں فرماتے ہیں۔

مفسرین عموماً ارض جرز کیلئے مثال میں مہر کا نام پیش کر دیتے ہیں
لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس سے مراد محض ”مہر“ ہے بلکہ
ارض جرز میں سے مہر بھی ہے۔ مہر میں ارض جرز کا ہونا قطعی ہے وہاں
کی زمین کی حالت یہ ہے کہ اگر بارش حسب ضرورت ہو تو مکانات منہدم
ہو جائیں اسلئے اللہ تعالیٰ وہاں بارش کے بجائے اس پانی کو لے جاتے
ہیں جو بلاد حبشہ میں برتا ہے۔

لے تفسیر ابن جریر ج ۱ ص ۶۶ لے حن الحافزہ ج ۱ ص ۴ لے ج ۳ ص ۶۲ تفسیر ابن کثیر۔

اسی مفہوم کو شیخ الاسلام ابن تیمیہ نے اپنے رسالہ عرشہ اور منہاج السنہ
میں بیان کیا ہے۔

منہاج السنہ میں ابن تیمیہ کے الفاظ یہ ہیں۔

فالارض الجرزلاتمطرمايكفيها ارض جرز میں اتنا پانی نہیں برستا جو اس
کارض مصر لوامطرت مطرالمغتاد کے لئے کافی ہو جیسے مہر کی زمین کہ اگر معمولی
لمكفيها فانها ارض ابليزوات بارش ہو تو وہ اس کو کافی نہیں، اس
امطرت مطراكثر امثل مطر لئے کہ مہر کی زمین کچھ والی ہے اور اگر زیادہ
شهر ازار، خربت المساكن فکان پانی برے مثلاً جتنی بارش کہ ماچ میں ہوتی
من حکمة الباری ورحمته ان امطرا ہے تو مکانات برباد جائیں۔ پس اللہ کی حکمت
رضا بعبدہ ثم ساق ذلك الى اور رحمت ہے کہ ایک در مقام پر برساتا
ارض مصر فهذه الايت يستدل ہے پھر اس پانی کو مصر لے جاتا ہے۔ اس
بها على علم الخالق وقدرته اب سے اللہ کے علم اس کی قدرت، اس
ومشيئة وحكمته۔ کی مشیت اور اس کی حکمت پر استدلال کیا
جاسکتا ہے۔

کس قدر دلچسپ بات ہے کہ جو چیز نولذیکی کے نزدیک نعوذ باللہ صاحب قرآن
کی بے خبری پر دلالت کرتی ہے۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ اسی سے خدا کے علم، اس کی قدرت
مشیت اور اس کی حکمت پر استدلال کرتے ہیں۔

یہ امر بھی خاص طور سے لائق توجہ ہے کہ یہ قحط مہر ہی میں نہ تھا بلکہ اس کے اثرات

لے ص ۱۳ لے ج ۳ ص ۱۱۔

دور دور تک تھے، برادران یوسف علیہ السلام کا غلہ کیلئے مصر آنا خود قرآن میں مذکور ہے۔
تورات میں بھی ان کا کنناں سے مصر تک غلہ کیلئے آنا مصر میں موجود ہے۔
”نہ صرف کنناں بلکہ اور بہت سے ملکوں کے لوگ غلہ کے لئے مصر
آتے تھے۔“

(پیدائش باب ۱۱)

عرب سے علاقہ یمن کے جنوب تک اسکے اثرات تاریخ سے ثابت ہیں چنانچہ یونینڈ
فارسٹر کے انگریزی ”تاریخی جغرافیہ عرب“ میں ابن ہشام کے حوالہ سے درج ہے کہ ملک
یمن میں سیلاب کے اثر سے ایک قبر کھل گئی جس میں ایک عورت کی لاش نظر آئی اُس کے
گلے میں موتیوں کے سات گلوبند ہاتھوں اور پیروں میں بازو بند اور سات سات چھڑے
بھی تھے۔ ہر ہر انگلی میں نگینہ کی بیش قیمت انگوٹھی اور سر ہانے زر و مال سے لبریز ایک
ایک صندوقچہ تھا۔ قبر میں ایک کتبہ بھی ملا۔ جس میں پہلے فقرے کے بعد پانچ اشعار
درج ہیں۔ اس کی نقل حسب ذیل ہے۔

باسمک اللہم اللہ حمیر
یا انا ناحہ بنت ذی شقر لعنت ما
یرنا الی یوسف فابطا علینا
فبعث لا ذقی،
تیرے نام سے لے اللہ لے اللہ لے حمیر
میں تاجہ بنت ذی شقر ہوں میں نے اپنے شاہی
داروغہ کو یوسف کے پاس بھیجا پھر جب واپسی
میں دیر ہوئی تو میں نے اپنی خواص کو بھیجا۔

(۲) بمد من ورق لتا تینی بمد
من طہین فلم تجده فبعثت بمد
چاندی کی ایک مقدار دیکر کہ اس کے عوض
میں آٹے کی ایک مقدار لائے پھر جب وہ نہ مل

من ذہب۔
سکانو پھر میں نے سونا دے کر بھیجا۔

(۳) فلم تجده فبعثت بمد من بحری
یصبی اور جب اس سے بھی نہ مل سکا تو پھر میں نے موتی
فلم تجده فامرت به فطحن۔
ان موتیوں کو پسوا ڈالا۔

(۴) فلم انتقم به فافتلت فن
سمع فلیبر حسنی۔
وہ کسی کام نہ آسکے سواب میں یہاں دفن ہوتی
ہوں۔ جو کوئی میری خبر پائے اسے چاہئے کہ میرے
اد پر ترس کھائے۔

(۵) وایہ امرأة لبست حلیمان
حلیتی فلا ماتت الا میتتی۔
اور اگر کوئی عورت میرے ان زیوروں پر طح کرے
اور انہیں پہننا چاہے تو اس کو میری ہی جیسی موت
نصیب ہو۔

اس کتبہ سے معلوم ہوا کہ یمن تک اس قحط کے اثرات یقینی تھے تورات تو صراحتاً
اس کی عالمگیری کی قائل ہے۔

(۵۳) اور سات برس ارزانی کے جو زمین مصر میں تھے، آخر ہوئے اور گرانی کے
سات برس جیسا کہ یوسف نے کہا تھا آنے شروع ہوئے۔

(۵۴) اور سب زمین میں گرانی ہوئی۔ پر ہنوز مصر کی ساری زمین میں روٹی تھی۔
(۵۵) پر جب ساری زمین مصر بھوک سے ہلاک ہونے لگی تو خلق روٹی کیلئے فرعون
کے آگے چلائی۔ فرعون نے سب مصریوں سے کہا کہ یوسف کئے جاؤ وہ جو تمہیں کہے کرو۔

(۵۶) اور تمام روئے زمین پر کال تھا اور یوسف نے زمین کے کھتے کھول کے مصریوں کے
ہاتھ نیچے اور مصر کی زمین پر کال بہت بڑھا (۵۷) اور سالے ملک مصر میں یوسف کئے

مول لینے آئے کیونکہ سب ملکوں میں سخت کال تھا۔

ان حوالہ جات سے بیرون مصر قحط کے اثرات کا جب ثبوت موجود ہے تو مسئلہ اور واضح ہو جاتا ہے اسلئے کہ اگر مصر کو بارش سے محروم بھی تسلیم کر لیا جائے تو سارا عالم تو بارش سے محروم نہ تھا اور قرآن پاک میں ”یغاث“ کے ساتھ ”الناس“ کا لفظ بھی ہے صرف اہل مصر کی تخصیص نہیں۔

(۷) اس موقع پر نفس آیت پر بھی ایک نظر ڈالنا چاہئے اور قرآن پر تنقید کے بجائے اس کے اعجاز و بلاغت اور اس کی صداقت کا اعتراف کرنا چاہئے۔

توریت کی منقولہ بالا آیت سے معلوم ہو چکا ہے کہ جب سالے عالم میں لوگ بھوک سے پریشان تھے، اس وقت مصر میں خوشحالی تھی۔ آیت یہ ہے۔

”اور سب زمین میں گرانی ہوگی پر ہنوز مصر کی ساری زمین میں روٹی ہوگی۔“

یہ خوشحالی درحقیقت حضرت یوسف علیہ السلام کی تعبیر خواب کے طفیل میں تھی جس

میں آپ نے ارشاد فرمایا تھا۔

تَذَرَعُونَ سَبْعَ سِنِينَ ذَا بَأْسًا
حَصَدْتُمْ فَذُرُّوْكَ فِي سُنْبُلِهِ
إِلَّا قَلِيلًا مِّمَّا تَأْكُلُونَ (یوسف)

تم سات سال متواتر غلہ بونا پھر جو فصل کاٹو اس کو بالوں میں بٹہ دینا مگر تھوڑا سا جو تمہارے کھانے میں آئے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کی اس تنبیہ کے باعث اہل مصر کو کسی قدر غلہ مل گیا تھا اور دوسرے ملکوں والے چونکہ بالکل بے خبر تھے اسلئے وہ کوئی انتظام نہ کر سکے۔ اب قابل غور امر یہ ہے کہ اس پوری آیت میں ”یغاث“، فریادری ہوگی، یا بارش ہوگی، اور

لے پیدائش باب۔

یعصرون (شیرہ پھوٹیں گے) کے سوا بچنے صیغے ہیں وہ سب حاضر کے ہیں (تذرعون) تم غلہ بونا۔ حَصَدْتُمْ۔ تم فصل کاٹو۔ تَأْكُلُونَ تم کھاؤ۔ (تَخْصِنُونَ) تم جمع کر کے گویا ان مخاطب صیغوں کا تعلق صرف اہل مصر سے ہے اور اسی لئے وہ نسبتاً نفع میں رہے اور ان کے بعد جو صیغے ہیں یعنی یغاث اور یعصرون وہ غائب کے صیغے ہیں۔

یہ التفات بے سبب نہیں ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بارش یا فریادری کا تعلق چونکہ دوسرے ملکوں سے بھی تھا اس لئے یہاں غائب کے صیغے استعمال کئے گئے تاکہ مفہوم میں عموم پیدا ہو اور نولد کی جیسے محققین کو یہ شبہ نہ پیدا ہو کہ مصر کی زمین تو بارانی نہیں ہے اسلئے وہاں بارش کیسے ہو سکتی ہے اور کاشت نیز غلہ کے جمع کرنے کا تعلق چونکہ صرف اہل مصر سے تھا اسی لئے وہاں خطاب کے صیغے استعمال کئے گئے ہیں۔

(واللہ اعلم بالصواب)

لے التفات علم معانی میان کی ایک اصطلاح ہے جس کا مفہوم ہے کہ ایک ہی ضمن کی گفتگو میں صیغوں اور طرز خطاب کا تغیر و تبدل مثلاً ابھی گفتگو میں حاضر کے صیغے استعمال ہو رہے تھے یکایک غائب یا متکلم کے صیغے استعمال ہونے لگے۔ ابھی ماضی کا استعمال تھا کہ مضارع کا استعمال ہونے لگا و مثل ذلک۔ یہ علم بلاغت کا ایک اہم شعبہ ہے اور قرآن پاک کے التفات میں بے انتہا نکات ہیں جو علم بلاغت سے دلچسپی رکھنے والوں پر پوشیدہ نہیں ہیں۔

پندرہویں صدی ہجری کے لئے مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ العالی کا ایک عظیم تحفہ
ایک حیات آفرین پیغام

تاریخ دعوت و عزیمت

(چھ حصوں میں)

حصہ اول: پہلی صدی ہجری سے لے کر ساتویں صدی ہجری تک عالم اسلام کی اصلاحی و تجدیدی کوششوں کا تاریخی جائزہ، نامور مصلحین اور ممتاز اصحاب دعوت و عزیمت کا مفصل تعارف، ان کے علمی کارناموں کی روداد اور ان کے اثرات و نتائج کا تذکرہ۔

حصہ دوم: جس میں آٹھویں صدی ہجری کے مشہور عالم و مصلح شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہ کی سوانح حیات، ان کے صفات و کمالات، ان کی علمی و تصنیفی خصوصیات، ان کا تجدیدی و اصلاحی کام اور ان کی اہم تصنیفات کا مفصل تعارف اور ان کے ممتاز تلامذہ اور متبیین کے حالات۔

حصہ سوم: حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ، سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیاؒ، حضرت مخدوم شیخ شرف الدین یحییٰ منیریؒ کے سوانح حیات، صفات و کمالات، تجدیدی و اصلاحی کارنامے، تلامذہ اور متبیین کا تذکرہ و تعارف۔

حصہ چہارم: یعنی مجدد الف ثانی حضرت شیخ احمد سرہندیؒ (۱۰۳۴-۱۰۶۸ھ) کی مفصل سوانح حیات، ان کا عہد اور ماحول، ان کے عظیم تجدیدی و انقلابی کارنامے کی اصل نوعیت کا بیان، ان کا اور ان کے سلسلے کے مشائخ کا اپنی اور بعد کی صدیوں پر گہرا اثر اور ان کی اصلاحی و تربیتی خدمات۔

حصہ پنجم: تذکرہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ، احيائے دین، اشاعت کتاب و سنت، اسرار و مقاصد شریعت کی توضیح و تبيين، تربیت و ارشاد اور ہندوستان میں ملت اسلامی کے تحفظ اور تنقح کے بقا کی ان عہد آفرین کوششوں کی روداد، جن کا آغاز حکیم الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ اور ان کے اخلاف و خلفاء کے ذریعے ہوا۔

حصہ ششم: حضرت سید احمد شہیدؒ کے مفصل سوانح حیات، آپ کے اصلاحی و تجدیدی کارنامے اور غیر منظم ہندوستان کی سب سے بڑی تحریک جہاد و تنظیم اصلاح و تجدید اور احيائے خلافت کی تاریخ۔ (دو جلدوں میں مکمل)

ناشر: فضل ربی ندوی

مجلس نشریات اسلام ۱۔ ۲۔ ناظم آبادیشن، ناظم آباد کراچی ۱۸

مُفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی چند اہم شاہکار تصنیفات

نبی رحمت مکمل
حدیث کا نبیادی کردار
معرکہ ایمان و مادیت
پرانے چراغ مکمل (دو حصے)
ارکان اربعہ
نفقوش اقبال
کاروانِ مدینہ
فتاویٰ نبوت
تغیر انسانیت
حدیث پاکستان
اصلاحیات
صحبتے باہل دل
کاروانِ زندگی مکمل
مذہب و تمدن
دستور حیات
حیات مجدد الحق
دوستیاد تصویریں
تحدہ پاکستان
پانچا سراغ زندگی
حالم عربی کا المیہ

سارخ دعوت و عزیمت مکمل (دو حصے)
مسلم ممالک میں اسلامیت اور غربیت کی کشمکش
انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر
منصب نبوت اور اس کے عالی مقام حاملین
ذرائع کا بل سے دربانے پر سوک تک
تذکرہ فضل الرحمن غنیمت مراد آبادی
تہذیب و تمدن پر اسلام کے اثرات و احسانات
تبلیغ و دعوت کا معجزانہ اسلوب
مغرب سے کچھ صاف صاف باتیں
نئی دنیا امریکہ میں صاف صاف باتیں
جب ایمان کی بہار آئی
مولانا محمد الیاس اور ان کی دینی دعوت
ہماز مقدس اور جزیرۃ العرب
عصر حاضر میں دین کی تفہیم و تشریح
تزکیہ و احسان یا تصوف و سلوک
مطالعہ قرآن کے مبادی اصول
سوانح شریف الحدیث مولانا محمد زکریا
خواتین اور دین کی خدمت
کاروانِ ایمان و عزیمت
سوانح مولانا عبد القادر رائے پوری

۱۲ اشرف فضل ربی ندوی — فون ۹۲۱۸۱۴-۹۲۰۸۹۹

مجلس نشریات اسلام آباد میٹیشن۔ ۱۔ کے۔ بی۔ ٹائم آباد کراچی ۱۲